الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

نقصان کیا ہے _____
وقت پر عمل کرنے سے چوک جانا

جنوری ۱۹۸۹
شمارہ ۱۴۶

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
〃 〃 جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۶ جنوری ۱۹۸۹

فہرست

	صفحہ		صفحہ
قرآن کا فیصلہ	۲	ایک تاثر	۲۰
زندگی کی تعمیر	۳	غور طلب	۲۱
بیعت الرضوان	۴	برائے اعزاز	۲۲
عمل کا رخ	۶	جوابی ذہنیت	۲۳
اپنی غلطی	۷	فطرتِ انسانی	۲۴
موجودہ سماج	۸	مٹانے کے بعد بھی	۳۲
مذہب اور سیاست	۹	نقصان در نقصان	۳۳
مسجد	۱۴	حقیقت بے نقاب	۳۵
حکیمانہ طریقہ	۱۷	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۵
مسائل ملت	۱۹	ایجنسی الرسالہ	۴۸

ماہنامہ الرسالہ : سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون: 697333, 611128

قرآن کا فیصلہ

قدیم مدینہ (یثرب) میں یہودی بھی آباد تھے اور غیر یہودی (مشرک) بھی۔ اس زمانہ میں یہودیوں کا یہ حال تھا کہ جب یہودی اور غیر یہودی آپس میں لڑتے، جب ایک یہودی دوسرے یہودی پر ظلم کرتا تو ان کے رہنما غیر جانبدار بنے رہتے۔ ایسے مواقع پر انھیں خدا کا یہ حکم یاد نہ آتا کہ ایک شخص دوسرے شخص کی جان، مال یا آبرو پر حملہ کرے تو اس کو اس سے روکو اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھو جب تک باہمی زیادتی کی یہ برائی معاشرہ سے ختم نہ ہو جائے۔ مگر اس قسم کا کوئی واقعہ جب یہودی اور غیر یہودی کے درمیان ہوتا، مثلاً ایک غیر یہودی (مشرک) کسی یہودی کی جان و مال پر تعدی کرتا تو فوراً تمام یہودی بیدار ہو جاتے۔ یہودی علماء اپنے حجروں سے نکل پڑتے اور یہودی لیڈر پُرجوش تقریریں شروع کر دیتے۔ اب ان کو آسمانی شریعت کی وہ تمام ہدایتیں یاد آجاتیں جو جان اور مال اور آبرو کے احترام کے لیے دی گئی ہیں۔

یہ دوسرا کام اگرچہ تمام تر خدائی شریعت کے حوالے سے کیا جاتا، مگر قرآن میں جب ان کی اس روش پر تبصرہ کیا گیا تو انھیں اس بظاہر دینی عمل پر کسی قسم کا کوئی کریڈٹ نہیں دیا گیا۔ اس کے برعکس ان کے لیے دردناک سزا کا اعلان کیا گیا۔ کہا گیا کہ یہودی اور یہودی کے درمیان زیادتی کے معاملہ میں تم کو کتابِ الٰہی کا حکم یاد نہیں آتا مگر یہودی اور غیر یہودی کے معاملہ میں تم کتابِ الٰہی کا نام لے کر پرشور تحریک چلاتے ہو۔ یہ دوعملی قابلِ انعام نہیں، قابلِ سزا ہے۔ جو لوگ ایسا کریں، ان کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ انھیں دنیا میں رسوائی ہو اور آخرت میں شدید ترین عذاب (البقرہ ۸۵)

قرآن کی یہ آیت موجودہ زمانہ کے مسلم علماء اور مسلم رہنماؤں پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ آج مسلمانوں کے درمیان ہر جگہ باہمی زیادتی کے واقعات ہو رہے ہیں۔ زیادتی اور ظلم کی کوئی قسم ایسی نہیں جو ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے خلاف جائز نہ کیے ہوئے ہو۔ مگر مسلم علماء اور مسلم رہنما ان کے بارہ میں بالکل غیر جانبدار بنے رہتے ہیں۔ البتہ اگر کہیں کوئی غیر مسلم مسلمانوں کے خلاف زیادتی کر دے تو تمام علماء اور تمام رہنما فوراً اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس قسم کی روش خدا کے نزدیک صرف ایک قابلِ سزا جرم ہے، نہ کہ کوئی دینی عمل جس پر آدمی کو انعام دیا جائے۔

زندگی کی تعمیر

اگر آپ جنوری ۱۹۸۹ میں ہوں تو دسمبر ۱۹۸۹ کی منزل تک پہونچنے کے لیے آپ کو بارہ مہینہ تک انتظار کرنا پڑے گا۔ زمین اپنے محور پر ۳۶۵ بار گھومے گی، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوگا کہ آپ کا ایک سال پورا ہو اور آپ تکمیلِ سال کے مرحلہ تک پہونچ سکیں ——— کتنی زیادہ معلوم ہے یہ حقیقت۔ مگر کتنے کم لوگ ہیں جو اس معلوم بات کو جانتے ہوں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان بار بار اقدام کرتے ہیں اور بار بار ناکام ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اقدام کے مذکورہ تقاضے پورے نہیں کرتے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو سب سے پہلے جو بات جاننی ہے وہ یہی ہے۔ انھیں اپنے بارہ میں اس حقیقت کو جاننا ہے کہ وہ تاریخ کے آغاز میں ہیں، وہ تاریخ کے اختتام میں نہیں ہیں۔ جو شخص راستہ کے ابتدائی سرے پر کھڑا ہوا ہو، وہ درمیانی فاصلہ کو طے کیے بغیر راستہ کے انتہائی سرے پر نہیں پہونچ سکتا۔

یہ اس دنیا کا ایک عالم گیر قانون ہے۔ مگر اس عالم گیر قانون کو مسلمانوں کے رہنما ملت کی تعمیر کے معاملہ میں بالکل بھول جاتے ہیں۔ وہ عملاً پہلے مہینہ میں ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ چھلانگ لگا کر آخری مہینہ میں جا پہنچیں۔ وہ بنیاد کی تعمیر نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ وہ اپنے خیالی مکان کی بالائی چھت پر کھڑے ہوئے نظر آئیں۔ واقعہ کے اعتبار سے وہ اپنے سفر کے آغاز میں ہوتے ہیں اور ایسے انتہائی الفاظ بولتے ہیں گویا کہ وہ درمیانی راستہ طے کیے بغیر اپنی آخری منزل پر پہونچ گیے ہیں۔

یاد رکھیے، ہمارا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ہم ایک بامقصد قوم تیار کریں۔ ہمیں قوم کے افراد کو وہ تعلیم دینا ہے جس سے وہ ماضی اور حال کو پہچانیں۔ ان کے اندر وہ شعور بیدار کرنا ہے کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہونا جانیں۔ ان کے اندر وہ حوصلہ ابھارنا ہے کہ وہ شخصی مفاد اور وقتی جذبات سے اوپر اٹھ کر قربانی دے سکیں۔

یہ سارے کام جب قابلِ لحاظ حد تک ہو چکے ہوں گے، اس کے بعد ہی کوئی ایسا اقدام کیا جا سکتا ہے جو فی الواقع ہمارے لیے کوئی نئی تاریخ پیدا کرنے والا ہو۔ اس سے پہلے اقدام کرنا صرف موت کے گڑھے میں چھلانگ لگانا ہے، نہ کہ زندگی کے چمنستان میں داخل ہونا۔

بیعت الرضوان

بیعت الرضوان (۶ ھ) اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے جو حدیبیہ کے ضمن میں پیش آیا۔ یہ سفر اصلاً عمرہ کرنے کے لیے ہوا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب حدیبیہ کے مقام پر پہونچے تو قریش نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا۔ اس وقت قریش سے آپ کی صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔ اس دوران آپ نے حضرت عثمان بن عفانؓ کو اپنا سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجا تاکہ وہ اہل مکہ کو بتائیں کہ آپ مکہ میں صرف عبادت کے لیے داخل ہونا چاہتے ہیں نہ کہ جنگ اور ٹکراؤ کے لیے۔

قریش اس بات پر راضی نہیں ہوئے۔ انھوں نے حضرت عثمان کو اپنے یہاں روک لیا۔ جب آپ کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو مشہور ہو گیا کہ قریش نے حضرت عثمان کو قتل کر دیا ہے۔ یہ خبر بے حد غیر معمولی تھی۔ چنانچہ اس کو سن کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے چودہ سو اصحاب کو جمع کیا اور ان سے بیعت لی۔ اسی بیعت کا نام بیعت الرضوان ہے۔

یہ بیعت کس بات پر تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ کچھ لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موت پر بیعت لی ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ، جو خود اس بیعت میں شریک تھے، انھوں نے تردید کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم سے موت پر بیعت نہیں لی۔ بلکہ اس بات پر بیعت لی کہ ہم بھاگیں گے نہیں (ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یبایعنا علی الموت ولکن بایعنا علی اَن لا نَفِرَّ) چنانچہ ابن قیم نے اس کے تذکرہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں:

فبایعوہ علیٰ ان لا یفروا)

حدیبیہ کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کامل امن پسندی کا مظاہرہ کیا۔ فریقِ ثانی کی اشتعال انگیزی کے باوجود آپ مشتعل نہیں ہوئے۔ ٹکراؤ کے ہر موقع سے یک طرفہ طور پر اعراض کرتے رہے۔ اپنی جماعت کے سب سے زیادہ نرم مزاج آدمی کو اس سفارت کے ساتھ بھیجا کہ ہم صلح کرنے کے لیے تیار ہیں۔ پھر جب قتل کی خبر ملی اس وقت بھی آپ نے ایسا نہیں کیا کہ خبر ملتے ہی قریش کے اوپر ٹوٹ پڑیں۔ بلکہ اپنے مقام پر ٹھہر کر لوگوں سے صرف اس بات کی بیعت لی

کہ ہم یہیں جمے رہیں گے۔ قریش اگر خود سے لڑنے کے لیے آتے ہیں تو مقابلہ کریں گے۔ اور اگر وہ صلح پر راضی ہوتے ہیں تو صلح کر لیں گے، خواہ یہ صلح یک طرفہ شرطوں پر کیوں نہ ہو، جیسا کہ آپ نے عملاً کیا۔ بیعت الرضوان کے باوجود صلح کر لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بیعت اصلاً جنگ کے لیے نہ تھی۔ اگر وہ جنگ کے لیے ہوتی تو ناممکن تھا کہ اس کے بعد آپ اپنے دشمن سے یک طرفہ شرطوں پر صلح کر لیں۔

حضرت عثمان بن عفان جب مکہ گیے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کی حیثیت سے وہاں گیے تھے۔ بین اقوامی رواج کے مطابق، سفیر کا قتل اعلانِ جنگ کے ہم معنی ہوتا ہے۔ جب یہ خبر ملی کہ قریش نے آپ کے سفیر کو قتل کر دیا ہے تو قدرتی طور پر آپ نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ قریش اب آخری طور پر آمادۂ جنگ ہو چکے ہیں، وہ کسی حال میں صلح اور امن کا معاملہ کرنے پر راضی نہیں ہیں۔ اس خبر نے وقتی طور پر صورت حال کو یکسر بدل دیا۔

ابتدائی صورت حال کے مطابق، آپ کے سامنے صلح یا جنگ میں انتخاب (Choice) کا مسئلہ تھا۔ اس وقت آپ نے جنگ کو چھوڑ کر صلح کا انتخاب فرمایا تھا۔ مگر قتلِ سفیر کی خبر نے ظاہر کیا کہ اب فرار یا جنگ میں سے کسی ایک صورت کے انتخاب (Choice) کا مسئلہ درپیش ہے۔ یعنی قریش کسی حال میں بھی صلح پر راضی نہیں ہیں۔ وہ ہر حال میں جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت آپ نے اپنے اصحاب سے عدمِ فرار، اور بصورتِ جارحیت دفاع کی بیعت لی۔ مگر جب معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی تو پھر دوبارہ آپ جنگ کو چھوڑ کر صلح پر راضی ہو گیے، حالاں کہ یہ صلح آپ کو دشمن کی یک طرفہ شرطوں پر کرنی پڑی۔

بیعت الرضوان کا پیغام یہ ہے کہ تمہارے لیے اگر انتخاب (Choice) فرار اور جنگ کے درمیان ہو تو فرار کو چھوڑ کر جنگ کا طریقہ اختیار کرو۔ اور اگر تمہارے لیے انتخاب (Choice) صلح اور جنگ کے درمیان ہو تو جنگ کو چھوڑ کر صلح کا طریقہ اختیار کرو، خواہ یہ صلح فریق ثانی کی یک طرفہ شرائط پر ہی کیوں نہ ہو۔ مزید یہ کہ فرار کے مقابلہ میں عدم فرار کو اختیار کرنے کا حکم بھی مشروط حکم ہے نہ کہ مطلق حکم۔ کیوں کہ حدیبیہ (۶ ھ) میں آپ نے فرار کے مقابلہ میں عدم فرار کا فیصلہ فرمایا۔ مگر اس سے پہلے مکہ (۱ ھ) میں اسی طرح کی صورت حال میں آپ نے وہاں سے ہجرت فرمائی۔

عمل کا رخ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ایمان لانے والوں سے کہو کہ ان لوگوں کو معاف کر دیں جو خدا کے دنوں کی امید نہیں رکھتے۔ تاکہ اللہ قوموں کو اس کا بدلہ دے جو وہ کر رہے تھے (قل للذین آمنوا یغفروا للذین لا یرجون ایام اللہ لیجزی قوما بما کانوا یکسبون)

یعنی جو لوگ اللہ کی پکڑ سے نہیں ڈرتے جب وہ خدا سے بے خوف ہو کر اہل اسلام کے خلاف ظالمانہ کارروائی کریں تو اہل اسلام کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ ان کے خلاف جوابی کارروائی کرنے یا ان سے انتقام لینے کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ اس کام کو انھیں خدا کے اوپر چھوڑ دینا چاہیے۔ خدا سے بے خوف ہو کر جو لوگ ظلم کریں، ان کو صرف خدا ہی ضروری سزا دے سکتا ہے۔ ایسے معاملات میں مسلمانوں کے اوپر صبر ہے اور اللہ کے اوپر جرم کے مطابق مجرم کی سزا۔

اس حکم کا مطلب بے عملی یا انفعالیت نہیں ہے اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ظالم کے مقابلہ میں سپر اندازی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یہ عمل کے رخ کو متعین کرنا ہے۔ یعنی ایسے موقع پر اہل اسلام کو جوابی کارروائی کے رخ پر متحرک ہونے کے بجائے ایجابی رخ پر عمل کرنے میں سرگرم ہونا چاہیے۔

انسان کا کام اپنی ذاتی ذمہ داری کو ادا کرنا ہے۔ خدا کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کے عمل کے مطابق، انھیں اس کا بدلہ دے۔ ایک شخص خدا کے دین کی دعوت لے کر اٹھے، اور کچھ لوگ اس کے ساتھ برا سلوک کریں، تو اس وقت داعی دو چیزوں کے درمیان کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ لوگوں کے آزار کو برداشت کرتے ہوئے اپنی دعوتی ذمہ داری کو بدستور جاری رکھے۔ دوسرے یہ کہ وہ دعوتی عمل سے غافل ہو کر لوگوں کو سزا دینے یا ان سے انتقام لینے کے لیے دوڑ پڑے۔ پہلا طریقہ خدا کے حکم کے مطابق ہے اور دوسرا طریقہ خدا کے حکم کے خلاف۔ پہلا طریقہ اختیار کرنے کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کام کے لیے خدا ان کی طرف سے کافی ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر مسلمان دوسری قسم کی روش کو اختیار کریں تو وہ دہرا مجرم بن جاتے ہیں۔ انھوں نے خدا کے کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور دوسرے یہ کہ ان کے اپنے لیے کرنے کا جو اصل کام تھا اس کو انھوں نے چھوڑ دیا۔

مومن کے عمل کا رخ ہمیشہ خدا کی طرف ہوتا ہے اور غیر مومن کے عمل کا رخ ہمیشہ انسان کی طرف۔

اپنی غلطی

ایک صاحب کا حال مجھے معلوم ہے۔ وہ نہایت تندرست تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اچھا ذہن عطا کیا تھا مگر وہ اپنی زندگی میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انھوں نے جو کام بھی کیا وہ ناکامی پر ختم ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ اسی حال میں وہ ایک روز سڑک پر ایک جیپ سے ٹکرا گیے۔ اس حادثہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کی ناکامی کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو کامیابی کے راستہ میں استعمال نہیں کیا۔ اپنی ناکامی کا ذمہ دار وہ ہمیشہ دوسروں کو قرار دیا کرتے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی اپنی ذات کے سوا کوئی بھی شخص نہیں جس کو واقعی طور پر ان کی ناکامی کا ذمہ دار بتایا جا سکے۔

انھوں نے تعلیم کے لیے اسکول میں داخلہ لیا۔ مگر وہ میٹرک تک پہونچے تھے کہ انھیں پالیٹکس سے دل چسپی ہو گئی۔ چنانچہ دسویں درجہ کے امتحان میں وہ فیل ہو گیے۔ اس کے بعد ان کی تعلیم آگے جاری نہ رہ سکی۔ انھوں نے ایک دکان شروع کی مگر اس کا کوئی مقرر وقت نہ تھا۔ جس وقت چاہتے وہ اپنی دکان کھولتے، اور جب چاہتے اس کو بند کر دیتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی دکان ختم ہو گئی۔ انھوں نے ایک ملازمت کی۔ وہ ملازمت ان کے مفروضہ معیار سے کم تھی۔ چنانچہ وہ مستقل جھنجھلاہٹ میں مبتلا رہتے اور اکثر اپنے مالک سے لڑ جاتے۔ آخر کار مالک نے عاجز آکر انھیں ملازمت سے نکال دیا۔ وغیرہ

اسی طرح وہ مختلف کام کرتے رہے اور ہر کام بے انجامی پر ختم ہوتا رہا۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی شکایت کرتے رہتے ـــــ فلاں متعصب ہے، فلاں نے عناد کی وجہ سے میرے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے۔ فلاں مجھ کو ترقی کرتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا۔ اسی طرح وہ اپنی ہر ناکامی کو دوسروں کے اوپر ڈالتے رہے۔ وہ ساری زندگی دوسروں کو غلط ثابت کرتے رہے، مگر آخری نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود غلط ہو کر رہ گیے۔

دوسروں کو اپنی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرانا بظاہر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ اس کی قیمت بہت مہنگی دینی پڑتی ہے۔ وہ یہ کہ آدمی کی بربادی ہمیشہ باقی رہے۔ اِس عالمِ اسباب میں وہ کبھی ختم ہی نہ ہو۔

موجودہ سماج

انڈین اکسپریس (۲۴ نومبر ۱۹۸۸) میرے سامنے ہے۔ اس کے صفحہ اول پر بتایا گیا ہے کہ دہلی کی ایک ۲۶ سالہ عورت پرویش کو اس کی ساس برسارانی نے مار ڈالا۔ اس نے اپنی بہو کے اوپر مٹی کا تیل انڈیل دیا اور پھر آگ لگا دی۔ صرف اس لیے کہ پرویش نے سسرال والوں کا یہ مطالبہ پورا نہیں کیا تھا کہ وہ اپنے میکے سے دس ہزار روپیہ لاکر انھیں دے۔ اگلے دن دوبارہ انڈین اکسپریس (۲۵ نومبر ۱۹۸۸) کے صفحہ اول پر یہ سرخی ہے:

Another dowry victim

خبر کے مطابق دہلی کی ۲۶ سالہ عورت اروین رانا کو اس کے سسرال والوں نے مار ڈالا۔ دوبارہ وجہ یہی تھی کہ سسرال والوں کے جہیز کے مطالبہ کو اس نے پورا نہیں کیا تھا۔ اس قسم کی خبریں ہر روز اخبارات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ پولس ان اموات کو جہیز کی موت (Dowry death) کہتی ہے۔ جہیز کی خاطر موت کے بڑھتے ہوئے واقعات کی بنا پر راجیہ سبھا میں اس کی بابت سوال اٹھایا گیا۔ وزارت داخلہ کے منسٹر آف اسٹیٹ مسٹر پی چدمبرم نے ہندستان ٹائمس (۲۵ نومبر ۱۹۸۸) کے مطابق جو اعداد و شمار بتائے، وہ یہ ہیں:

۱۹۸۵	میں	۹۹۹ موتیں
۱۹۸۶		۱۳۱۹
۱۹۸۷		۱۷۸۶

ہندستان کا موجودہ سماج جس وحشت و بربریت کی سطح کو پہونچ چکا ہے، یہ اس کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس قسم کے واقعات بتاتے ہیں کہ آج ہم جس سماج میں رہ رہے ہیں وہ خونخوار بھیڑیوں کا سماج ہے نہ کہ شریف انسانوں کا سماج۔ ایسی حالت میں فرقہ وارانہ فسادات پر چیخ پکار کرنا یا ان کے خلاف مذمت کے بیانات دینا، ایک ایسا فعل ہے جو احمقانہ ردعمل کے سوا کسی اور خانہ میں جانے والا نہیں۔ ایسی حالت میں کسی سمجھ دار آدمی کے لیے بچاؤ کا راستہ صرف ایک ہے۔ وہ انسان نما حیوانوں کے ساتھ اعراض کرے۔ ان کی طرف سے اشتعال انگیزی کا واقعہ پیش آئے تب بھی وہ مشتعل نہ ہو۔ کوئی آدمی حیوان سے نہیں لڑتا، حیوان سے اعراض کیا جاتا ہے نہ کہ جنگ۔

مذہب اور سیاست

مذہب کیا ہے۔ مذہب ان روحانی قدروں اور انسانی اصولوں میں جینے کا نام ہے جن کو خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ بتایا ہے۔ مذہب کا پہلا اصول توحید ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں صرف ایک حقیقت ایسی ہے جو سب سے اوپر ہے، جو سب سے بالا ہے، اور وہ خدا ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے۔ وہ اس سے گھمنڈ کا جذبہ چھین لیتا ہے جو تمام برائیوں کی اصل جڑ ہے۔

مذہب کا دوسرا اصول مساوات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انسان ایک ہی خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اور سب کے سب ایک ہی آدم کی اولاد ہیں۔ مذہب کا یہ اصول انسان اور انسان کے درمیان ہر قسم کی اونچ نیچ کو مٹا دیتا ہے۔ خواہ وہ دولت اور عہدہ کی وجہ سے ہو، یا رنگ اور نسل کی وجہ سے یا اور کسی وجہ سے۔ اس مذہبی عقیدہ کے مطابق تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔ سب کو ایک مشترک خاندان کی طرح مل جل کر رہنا چاہئے۔

مذہب کا تیسرا بنیادی اصول عدل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سماجی تعلقات اور آپس کے لین دین میں ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ دوسرے آدمی کے ساتھ برابری اور انصاف کا معاملہ کرے۔ جس طرح ترازو ٹھیک ٹھیک تولتا ہے اسی طرح انسان کو بھی ٹھیک ٹھیک تولنا چاہئے۔ انسان کا ہر معاملہ اسی طرح درست ہونا چاہئے جس طرح ترازو کی تول بالکل درست ہوتی ہے۔

یہی مذہب کی اصل حقیقت ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مذہب درحقیقت کچھ قدروں اور کچھ پیمانوں کا نام ہے۔ وہ ایک فرد کو سوچ اور مزاج کے اعتبار سے، خاص طرح کا انسان بناتا ہے۔ ایسا انسان جو دنیا میں تواضع کی نفسیات کے ساتھ جئے۔ جو سچائی کے آگے جھک جائے۔ جو تمام انسانوں کو اپنا سمجھے، جس کو کوئی انسان غیر نظر نہ آئے۔ جو دوسرے انسان کے ساتھ وہی سلوک کرے جو وہ خود اپنے ساتھ چاہتا ہے۔ جو اپنے آپ کو بھی اسی پیمانہ سے ناپے جس پیمانہ سے وہ دوسروں کو ناپنا چاہتا ہے۔

اس طرح مذہب انسان کی زندگی کو جانوروں کی زندگی سے الگ کر دیتا ہے۔ جانور صرف ایک ہی بات کو جانتے ہیں۔ اور وہ ان کا فائدہ ہے۔ وہ اپنے غرض اور فائدہ کے سوا کسی اور چیز سے واقف نہیں۔ مگر مذہبی انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ مذہبی انسان کی زندگی کچھ قدروں اور کچھ اصولوں

کے تابع ہوتی ہے۔ وہ اپنی خواہش پر نہیں چلتا۔ بلکہ اپنے عقلی فیصلہ کے مطابق عمل کرتا ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو حق کے مطابق کرنا چاہئے۔ اور وہ نہیں کرتا جس کا کرنا حق کے مطابق اس کے لئے درست نہیں۔

مذہب کی اس حقیقت کو سامنے رکھنے کے بعد یہ بات اپنے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ مذہب کا تعلق سیاست سے کیا ہے۔ وہ چیز جس کو آجکل سیاست کہا جاتا ہے اس سے مذہب کا براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ البتہ بالواسطہ طور پر مذہب کا تعلق سیاست سے اسی طرح ہے جس طرح اس کا تعلق دوسری تمام انسانی سرگرمیوں سے ہے۔

ایک شخص جو صحیح معنوں میں مذہبی ہو اور مذہب کو اس کی روح کے اعتبار سے اپنائے ہوئے ہو تو وہ زندگی کے جس شعبہ میں بھی داخل ہوگا اس کا مذہب بھی اس کے ساتھ ساتھ رہے گا۔ اس کا رویہ ہر معاملہ میں مذہبی انسان کا رویہ ہوگا۔ مثلاً وہ سڑک پر چل رہا ہو تو وہ ٹریفک کے اصولوں کی پوری پابندی کرتا ہوا چلے گا۔ وہ کسی سروس میں ہو تو وہ حسب قاعدہ اپنی پوری ڈیوٹی انجام دے گا۔ وہ تاجر ہو تو اس کی تجارت لوٹ اور دھوکہ بازی کی تجارت نہیں ہوگی بلکہ دیانت داری کی تجارت ہوگی۔ ایک سچا مذہبی انسان خود اپنے اندرونی جذبہ کے تحت مجبور ہوتا ہے کہ وہ جہاں بھی رہے بااصول انسان کی طرح رہے۔ وہ کسی بھی حال میں بے اصولی اور خود غرضی کا طریقہ اختیار نہ کرے۔

یہی معاملہ سیاست کا بھی ہے۔ ایک مذہبی انسان سیاست میں بھی، براہ راست یا بالواسطہ طور پر داخل ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں بھی وہ اپنے مذہبی مزاج کے تحت اپنا سیاسی عمل کرے گا نہ کہ مذہبی مزاج کو چھوڑ کر۔ اس کی سیاست دوبارہ بااصول سیاست ہوگی نہ کہ مصلحت پرستی کی سیاست۔ وہ سیاسی مواقع کو قوم اور ملک کی خدمت کے لئے استعمال کرے گا نہ کہ قوم اور ملک کو لوٹنے کے لئے۔ وہ اپنی سیاسی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے جھوٹ نہیں بولے گا۔ بلکہ اپنی غلطیوں کا کھلے طور پر اعتراف کرے گا، خواہ اس اقرار کی قیمت اس کو یہ دینی پڑے کہ وہ سیاسی عہدہ یا سیاسی اقتدار سے محروم ہو جائے۔

ایک شخص سیاست میں مذہب کا نام لے تو اس کا لازمی مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مذہبی آدمی ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ ایک خود غرض سیاست داں ہو اور مذہب کا نام صرف اس لئے استعمال کر رہا ہو کہ اس کے ذریعہ سے عوام کو دھوکہ دے۔ وہ اپنی خود غرضی کی سیاست چلائے اور ظاہر یہ کرے کہ وہ مذہب کی سیاست چلا رہا ہے۔

مشہور مثل ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح مذہب کے نام پر چلائی جانے والی سیاست کو بھی اس کے نتیجہ کے اعتبار سے جانچنا چاہئے۔ اگر یہ سیاست اخلاق اور انسانیت کی فصل اگانے والی ہو تو وہ مذہبی لوگوں کی سیاست ہے۔ اور اگر اس کے نتیجہ میں باہمی ٹکراؤ اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا جھاڑ جھنکاڑ پیدا ہو تو یقینی طور پر وہ استحصالی سیاست ہے۔ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔

اگر کہا جائے کہ مذہبی تجارت یا مذہبی ڈاکٹری، تو یہ الفاظ بے معنی معلوم ہوں گے۔ لیکن اگر ہم لفظ بدل دیں اور یوں کہیں کہ مذہبی آدمی کی تجارت یا مذہبی آدمی کی ڈاکٹری، تو پھر یہ الفاظ بے معنی معلوم نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ مذہبی تجارت یا مذہبی ڈاکٹری کسی چیز کا نام نہیں۔ مگر مذہبی آدمی کی تجارت واقعۃً ایک چیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص جو اپنی سوچ اور اپنے ذہن کے اعتبار سے مذہبی ہو۔ ایسا آدمی جب تجارت کرے گا تو اس میں وہ اپنے مذہبی اصولوں کا لحاظ کرے گا۔ مثلاً وہ گاہک کو دھوکا نہیں دے گا۔ وہ لین دین میں خیانت نہیں کرے گا۔ وغیرہ۔ اس طرح اس کی تجارت مذہبی آدمی کی تجارت بن جائے گی۔

اسی طرح ایک شخص سچا مذہبی ہو، اس کے بعد وہ ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کرے تو وہ اپنے مریضوں کو صرف پیسہ لوٹنے کا ذریعہ نہیں سمجھے گا۔ بلکہ وہ ان کا ہمدرد ہوگا۔ وہ ان کو صحیح دوا دے گا۔ وہ ان کا خیر خواہ بن کر ان کا علاج کرے گا۔ اس طرح کا اعلیٰ سلوک اس کی ڈاکٹری کو ایک مذہبی انسان کی ڈاکٹری بنا دے گا۔

گویا مذہب عملی اعتبار سے مذہبی انسان کا نام ہے۔ اگر واقعۃً کسی سماج میں مذہبی انسان ہیں تو ان کے مذہبی عمل سے سماج میں مذہبی ماحول پیدا ہوگا۔ اور اگر ایسے انسان نہ ہوں جو واقعی معنوں مذہبی ہوں تو ایسا سماج مذہبی سماج نہیں بن سکتا، خواہ وہاں مذہبی نعرہ لگانے والوں کی بھیڑ اکٹھا ہو، خواہ وہاں مذہب کے نام پر کتنے ہی ہنگامے جاری ہوں۔

مذہبی تجارت حقیقۃً مذہبی انسان کی تجارت کا دوسرا نام ہے۔ مذہبی انسان کے بغیر وہ تجارت وجود میں نہیں آسکتی جس کو مذہبی تجارت کہا جاسکے۔ اسی طرح اگر مذہبی سیاست کوئی چیز ہو تو وہ بھی مذہبی انسان کی سیاست کا دوسرا نام ہوگی۔ حقیقی مذہبی انسان کے بغیر حقیقی مذہبی سیاست کا کوئی

وجود نہیں۔

جو لوگ مذہب کی اس حقیقت کو نہیں جانتے وہ "مذہبی حکومت" بنانے کا نعرہ لگاتے ہیں، حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ "مذہبی انسان" بنانے کی کوشش کی جائے۔ "مذہبی حکومت بناؤ" کا نعرہ ایک بے معنی نعرہ ہے جو صرف سماجی جھگڑے اور قومی فساد میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر "مذہبی انسان بناؤ" کا مشن چلایا جائے تو سماج میں جھگڑا گھٹے گا اور فساد ختم ہوگا۔

"مذہبی تجارت" اگر کوئی چیز ہو تو وہ مذہبی انسان کی تجارت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی انسان کے بغیر مذہبی تجارت کے کوئی معنی نہیں۔ اسی طرح "مذہبی سیاست" اگر کوئی چیز ہو تو وہ بھی مذہبی انسان کی سیاست کا دوسرا نام ہوگی۔

سچے مذہبی انسان کی روش ہی کسی سیاست کو مذہبی رنگ دیتی ہے۔ اگر سچے مذہبی انسان نہ ہوں تو مذہبی نعرے بازی یا مذہب کے نام پر ہنگامہ آرائی سے کوئی سیاست مذہبی سیاست نہیں بن سکتی، خواہ اس قسم کی کوشش میں ہزاروں سال لگا دئے جائیں۔

مذہب اور سیاست یا سیاست اور مذہب کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ سیاست کو مذہب کے لئے استعمال کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ مذہب کو سیاست کے لئے استعمال کیا جائے۔ پہلی صورت مذہب کے مطابق ہے اور انسانیت کے لئے رحمت ہے۔ جب کہ دوسری صورت سراسر مذہب کے خلاف ہے اور انسانیت کے لئے ایک سماجی عذاب سے کم نہیں۔

مذہب کے بارے میں خاص طور پر مشرقی ملکوں میں لوگ بہت حساس ہوتے ہیں۔ اگر مذہب کے نام پر کوئی اشو کھڑا کیا جائے تو وہ فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس بنا پر خود غرض سیاستداں اپنی لیڈری کو نمایاں کرنے کے لئے اس کو سب سے زیادہ آسان سمجھتے ہیں کہ "مذہب خطرہ میں" جیسا کوئی نعرہ بلند کریں اور لوگوں میں اِدھر سے اُدھر تک آگ لگا دیں۔ اس آگ کی روشنی میں لیڈر کا اپنا چہرہ تو خوب روشن ہو جاتا ہے مگر عام انسان اس کی آگ میں جھلس کر رہ جاتے ہیں۔

صحیح سیاست اور غلط سیاست کو ناپنے کا ایک بہت کھلا ہوا معیار ہے۔ جو سیاست محبت کی بنیاد پر اٹھائی جائے وہ سچی سیاست ہے۔ اور جو سیاست نفرت کی بنیاد پر اٹھائی جائے وہ جھوٹی سیاست۔

اب چونکہ مذہب تمام انسانوں سے محبت اور خیر خواہی کی تعلیم دیتا ہے اس لئے جب کوئی سچا مذہبی انسان سیاست کے میدان میں آئے گا تو وہ انسانوں کی محبت کی بنیاد پر اپنی سیاسی تحریک چلائے گا۔ وہ سیاست میں ان اعلیٰ انسانی قدروں کو شامل کرے گا جو مذہب کا روح اور خلاصہ ہیں۔ مثلاً بے غرضی، اصول پسندی، انصاف، استحصال سے بچنا، حقوق سے زیادہ ذمہ داریوں کا خیال، وغیرہ۔

اس کے برعکس اگر کوئی شخص مذہب کا نام لیتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ وہ نفرت اور تشدد کی سیاست چلانا چاہتا ہے تو یقینی طور پر وہ مذہبی نہیں ہے۔ وہ مذہب کو صرف اپنے خود غرضانہ مقاصد کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ کیوں کہ مذہب اور نفرت یا مذہب اور تشدد دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

مذہب اور سیاست کا لفظ ایسا ہی ہے جیسے محبت اور سیاست کا لفظ۔ محبت سے بھرا ہوا دل، خواہ وہ سیاست کے پلیٹ فارم پر ہو یا اور کسی پلیٹ فارم پر، کبھی نفرت اور دشمنی کی بات نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جس انسان کے اندر مذہب کی روح اتری ہوئی ہو وہ کبھی نفرت اور دشمنی کی بات نہیں کرے گا، خواہ وہ سیاست کے میدان میں ہو یا کسی اور میدان میں۔

نوٹ: آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۸ کو نشر کیا گیا۔

مسجد

"ہمارا مقصد مسجد والے اعمال کو زندہ کرنا ہے" تبلیغی جماعت کے لوگ جب یہ بات کہتے ہیں تو عام لوگوں کو بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی بات ہے، بلکہ یہی سب سے بڑی بات ہے۔ "مسجد والے اعمال" کو اگر کسی جامع معنی میں نہ لیا جائے تو اس میں دین کی ساری حقیقت آجاتی ہے۔

مسجد والے اعمال کیا ہیں۔ مسجد والے اعمال یہ ہیں کہ آدمی کے اندر دینی شعور پیدا کیا جائے۔ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو انسانی شعور ہی انسانی عمل کی بنیاد ہے۔ انسان کا خارجی عمل اس کے اندرونی شعور ہی کا خارجی ظہور ہوتا ہے۔ مسجد اسی ربانی شعور کی تعمیر کا مرکز ہے۔ اسی طرح ہر آدمی کا کوئی شعوری مرکز ہوتا ہے۔ ہر آدمی گویا کسی نہ کسی "مسجد" پر کھڑا ہوا ہے۔ دوسرے لوگ غیر خدائی مسجد پر کھڑے ہوتے ہیں۔ مسلمان وہ ہے جو خدائی مسجد کے اوپر اپنے آپ کو کھڑا کرے۔

ایک سیاح جس نے دنیا کے اکثر حصوں کا سفر کیا ہے، لکھتا ہے کہ مختلف ملکوں کے سفر کے دوران میں نے ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ غیر مسلم ملکوں میں ہر جگہ قدیم زمانہ کے بڑے بڑے قلعے کھڑے ہوئے ہیں۔ جب کہ مسلم دنیا میں اس قسم کے مناظر بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ ہر مسلم شہر میں عالیشان مسجدیں ضرور ہیں جن کے اونچے مینار دور سے ان کے وجود کا پتہ دیتے ہیں۔ غیر مسلم ملکوں کی نمایاں عمارتیں اگر ان کے قلعے ہیں تو مسلم ملکوں کی نمایاں عمارتیں ان کی مسجدیں۔

یہ فرق دونوں قسم کے لوگوں کے مزاج کا پتہ دیتا ہے۔ غیر مسلم قوموں کا اعتماد مادی اسباب پر تھا، اس لئے انھوں نے قلعے اور حصار کھڑے کئے۔ اس کے برعکس مسلم قوموں کے عقیدہ کے مطابق ان کا اعتماد اللہ پر تھا۔ اس لئے وہ جہاں پہنچے، انھوں نے بڑی بڑی مسجدیں بنائیں۔

مسجد، محدود معنوں میں، صرف عبادت گھر نہیں، وہ اسلام کے حق میں خدائی قلعہ ہے۔ مسجدیں اسلامی دنیا کی نگہبان ہیں۔ مسجد کے ذریعہ اسلام اپنی حیثیت کو زمین پر قائم کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے وہ دلوں کو مسخر کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد قائم ہوتا ہے ایک حدیث میں مسجد کو اللہ سے ڈرنے والوں کا گھر کہا گیا ہے (المساجد بیوت المتقین)

مسجد خدا کا گھر ہے۔ مسجد میں خدائی اعمال کے ذریعہ ایک ایسا ماحول پیدا کیا جاتا ہے جہاں آکر مسلمان اپنے آپ کو اپنے رب کی چھاؤں میں محسوس کریں۔ وہاں سے دینی معرفت کی غذا لے کر باہر کی دنیا کی طرف لوٹیں۔ خود اسلام پر قائم ہوں اور دوسرے بندگان خدا کو اسلام پر قائم رکھنے کی کوشش کریں۔

مسجد ایک قسم کا دار الاسلام ہے۔ وہ اللہ کی یاد کی جگہ ہے۔ وہ اسلامی اتحاد کی تربیت گاہ ہے۔ وہ مسلمانوں کے اعتماد علی اللہ کا نشان ہے۔ وہ اسلام کی دعوتی اور اصلاحی سرگرمیوں کا مرکز ہے جب اسلام زندہ تھا تو مسجد صرف مسجد نہ تھی بلکہ وہاں اسلامی زندگی کے تمام شعبے قائم ہوتے تھے۔ مثلاً عبادت گاہ، مدرسہ، دار القضاء، اجتماع گاہ، اسپتال، کتب خانہ، مسافر خانہ، مقام مشاورت اصلاحی و تبلیغی مرکز وغیرہ۔

مصر میں جب بنی اسرائیل کے لئے زمین تنگ ہوگئی تو حکم ہوا کہ اپنے گھروں کو مسجد بنا لو (یونس۔ ۸۷) اس سے معلوم ہوا کہ حالات جب اہل ایمان کو پسپا کرتے کرتے ان کو آخری جائے پناہ (گھر) تک پہنچا دیں تو اس وقت ان کا گھر ہی جد وجہد کا میدان بن جاتا ہے۔ وہ اپنے گھروں کو مسجد کی صورت دے کر وہاں اپنے کو صبر و نماز کے ساتھ وابستہ کر دیتے ہیں۔ وہ اعتماد علی اللہ اور تعلق مع اللہ میں اپنا مستقبل تلاش کرنے لگتے ہیں۔ مسجد اہل ایمان کے لئے صرف در و دیوار کا مجموعہ نہیں، وہ اپنے رب سے لپٹنے کے لئے تنہائی کا ماحول ہے۔ اور اللہ پر بھروسہ کا مزاج پیدا کرنے لئے مقام تربیت ہے۔ "مسجد" اس بات کا نشان ہے کہ اہل ایمان کا قافلہ خواہ کتنا ہی پیچھے دھکیل دیا جائے، اس کے لئے ہر حال میں ایک نئے سفر کا نقطۂ آغاز موجود رہتا ہے۔ اس آخری قلعہ کو کسی حال میں کوئی ان سے چھین نہیں سکتا۔

اسی کے ساتھ مسجد کا ایک عمل اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ مسجد کی دنیا میں خدا پرستی اور آخرت پسندی کا ماحول پیدا کر کے دوسری قوموں کے افراد کو موقع دیا جائے کہ وہ یہاں آکر اسلام کا مطالعہ و مشاہدہ کریں۔ اور اس بات سے آگاہی حاصل کریں کہ ان کے رب کی مرضی ان کے بارہ میں کیا ہے اور موت کے بعد خدا کی عدالت میں ان سے کس قسم کا سوال کیا جانے والا ہے۔ مسجد کی یہ دعوتی اور تبلیغی حیثیت قرآن میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

"اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تجھ سے امان کا طالب ہو تو اس کو اپنے پاس آنے دو تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے۔ پھر اس کو اس کے ٹھکانے تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے (توبہ ۶)

معلوم ہوا کہ اسلام کا گھر، مسلمانوں کے لئے عبادت اور اصلاح کا مقام ہونے کے ساتھ، دوسری قوموں تک خدا کا پیغام پہنچانے کا مرکز بھی ہے۔ یہ جس طرح اسلام کے سمٹنے کی جگہ ہے، اسی طرح وہ اسلام کے پھیلنے کا نقطہ بھی ہے۔ یہاں خدا کا دین استحکام حاصل کرتا ہے اور یہیں سے وہ اپنے سفر کو بھی جاری کرتا ہے۔ یہ اسلام کا سمندر بھی ہے اور اس کا بھاپ اٹھنے کا مقام بھی۔

مسجد کے اندر تبلیغ کی تاثیر اور تبلیغ کی عظمت تاریخ سے ثابت ہے۔ مغل قبائل نے تیرھویں صدی عیسوی میں مشرق کی جانب سے عالم اسلام پر حملہ کیا، اور اس کے بڑے حصہ میں اسلام کے نشانات کو مٹا ڈالا۔ مگر اسلام کے انھیں کھنڈروں سے اسلام دوبارہ ایک تسخیری طاقت بن کر ابھرا۔ مغلوں نے اسلام قبول کر لیا۔ وہی مسجدیں جن کو ہلاکو نے سمرقند سے حلب تک اپنے راستہ میں تباہ کر دیا تھا، اس کے پوتوں نے دوبارہ ان مسجدوں کی تعمیر کی اور ان کی چھتوں کے نیچے خدائے واحد کے آگے سجدہ کیا۔

آج اسلام کو جو چیلنج درپیش ہے، اس کے جواب کی صورت یہ ہے کہ مسجد کو اس کے پورے معنوں میں زندہ کیا جائے۔ ایک عرب عالم دکتور حسین مونس کے یہ الفاظ نہایت صحیح ہیں:

ان الاسلام الیوم یخوض معرکۃ والمساجد من اھم اسلحتنا فیھا

آج اسلام کو ایک جنگ کا سامنا ہے اور اس میں مسجدیں ہمارا نہایت اہم ہتھیار ہیں۔

الوعی الاسلامی (کویت)، رجب ۱۳۹۳ھ، صفحہ ۶۰

میوات کا سفر

صفحات ۲۲۰ ھدیہ ۲۵ روپیہ

حکیمانہ طریقہ

معین الدین صاحب (پیدائش ۱۹۵۶) بگہا (ضلع چمپارن) کے رہنے والے ہیں۔ ۱۴ اگست ۱۹۸۸ کی ملاقات میں انھوں نے اپنے یہاں کا ایک واقعہ بتایا جو بے حد سبق آموز ہے۔

بگہا کی جامع مسجد کا نام جامعہ انوار ہے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۸۸ کی رات کو کسی شخص نے خنزیر کاٹ کر اس کا سر مسجد کے اندر سائبان والے حصہ میں ڈال دیا۔ صبح کے وقت جب لوگ نماز فجر کے لئے آئے تو نماز کی ادائگی کے بعد ایک شخص (ارمانی خاں) نے اس کو دیکھا۔ اس وقت بگہا کے امیر تبلیغ حاجی اسرار الحق صاحب حسب معمول نمازیوں کو بیٹھا کر تعلیم کر رہے تھے۔ ارمانی خاں نے واقعہ کی خبر دی تو وہ فوراً اٹھ کر مقام واردات پر آئے۔ انھوں نے دیکھا کہ واقعۃً خنزیر کا کٹا ہوا سر مسجد کے اندر پڑا ہے۔

حاجی اسرار الحق صاحب جو الرسالہ کے مستقل قاری ہیں، انھوں نے شور وغل کرنے کے بجائے یہ کیا کہ فوراً اس کو کپڑے میں لپیٹ کر اٹھا لیا۔ پھر موذن کے ہمراہ وہ تیزی سے اس کو لے کر باہر نکلے اور لے جا کر بیت الخلاء کے کنوئیں (بورنگ) کے اندر ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ مسجد میں آئے اور پانی سے اچھی طرح دھو کر مسجد کو صاف کر دیا۔ اس کے بعد حاجی صاحب ڈاکٹر ایم یو خان سے ملے۔ انھوں نے حاجی صاحب کی کارروائی سے اتفاق کیا۔ دونوں مقامی تھانہ میں گئے۔ وہاں انھوں نے پولیس کو پورے واقعہ کی خبر دے دی۔ تھانہ والوں نے حاجی صاحب کی بہت تعریف کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو ہمارے اوپر پہاڑ اتنا بڑا بوجھ تھا، آپ نے اس کو ہمارے سر سے ٹال دیا۔

بگہا کے مہتر خنزیر پالتے ہیں اور اس کا کاروبار کرتے ہیں۔ پولیس والے مہتروں کی بستی میں گئے اور ان کو سخت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ تاہم اصل مہتر جس نے کسی کے کہنے پر یہ کارروائی کی تھی، وہ رات ہی کو بھاگ کر نیپال چلا گیا۔

معین الدین صاحب نے بتایا کہ خبر سن کر بڑی تعداد میں مسلمان مسجد میں جمع ہو گئے اور انھوں نے حاجی صاحب کو برا بھلا کہا۔ مگر ساری بستی کے ہندوؤں نے ان کی تعریف کی۔ مثلاً ایک ہندو دکاندار نے کہا کہ حاجی صاحب نے وہ کام کیا ہے جو مہان آدمی کیا کرتا ہے۔ انھوں نے

سیکڑوں آدمیوں کو ہتیا ہونے سے بچالیا۔ ایک اور ہندو نے کہا کہ جس شخص نے مسجد میں خنزیر ڈالا وہ بہت گرا ہوا انسان ہے۔ جو شخص عبادت خانہ کو گندا کرے اس سے زیادہ برا آدمی اور کوئی نہیں۔ وغیرہ۔

حاجی صاحب نے اعراض اور حکمت کے طریقہ کو اختیار کرکے پوری بستی کو تباہی و بربادی سے بچالیا۔ اگر وہ خنزیر کو دیکھ کر مشتعل ہو جاتے تو بگھا یقینی طور پر فساد کی نذر ہو جاتا۔

معین الدین صاحب سے میں نے پوچھا کہ اس معاملہ میں عام مسلمانوں کا ردعمل کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ خبر پھیلی تو مسلمان ادھر اُدھر سے آکر مسجد میں جمع ہونے لگے۔ گیارہ بجے تک ہزاروں کی تعداد میں مسلمان وہاں آچکے تھے۔ وہ لوگ سخت غصہ میں تھے اور حاجی اسرار الحق صاحب کے اوپر بری طرح برس رہے تھے۔ کچھ لوگ برا بھلا کہہ رہے تھے۔ کچھ باقاعدہ گالی دے رہے تھے۔ ساری باتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ تم بزدل ہو، تم پست ہمت ہو۔ تم نے کیوں خنزیر کو غائب کیا۔ اگر وہ ہمارے پاس موجود ہوتا تو آج ہم انھیں بتادیتے.....

میں نے کہا کہ یہ بزدلی اور بہادری کا وہ معیار ہے جو مسلمانوں کی قومی شریعت میں پایا جاتا ہے۔ خدا کی شریعت کا معیار اس سے مختلف ہے۔ خدا کی شریعت کا معیار حدیث میں اس طرح بتایا گیا ہے:

عن ابی هريرة، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ليس الشديد بالصرعة. انما الشديد الذى يملك نفسه عند الغضب (متفق عليه)

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طاقتور وہ نہیں ہے جو کشتی میں کسی کو پچھاڑ دے۔ طاقتور وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔

مذکورہ حدیث بہادری کا یہ معیار بتاتی ہے کہ آدمی غصہ دلانے کے باوجود غصہ نہ ہو۔ اشتعال انگیزی کے باوجود وہ اشتعال میں نہ آئے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے نزدیک بہادری یہ ہے کہ کوئی شخص اگر غصہ دلانے والا فعل کرے تو وہ بھڑک کر اس سے لڑنا شروع کر دیں۔ مسلمان ایسے واقعات کو قومی وقار کا مسئلہ بنالیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ فوراً فریق مخالف سے لڑ جاتے ہیں۔ اگر وہ اس کو شرعی نگاہ سے دیکھیں تو وہ وہی کریں جو مذکورہ حاجی صاحب نے ایسے موقع پر کیا۔

مسائل ملّت

فرد ملّت کے مسائل کا جو حل ہے، وہی خود ملّت کے مسائل کا حل بھی ہے۔ ملت کا ایک فرد اپنی ذاتی کوشش سے اپنی زندگی کی تعمیر کرتا ہے۔ اسی طرح مجموعہ افراد جس کا نام ملت ہے، اس کے مسائل بھی اس کی اپنی کوششوں سے حل ہوں گے۔ کوئی دوسرا اس کے مسائل کو حل کرنے والا نہیں۔

اس دنیا میں ایک بھائی کبھی دوسرے بھائی کے لئے نہیں کماتا۔ کوئی رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کے لئے لڑائی نہیں لڑتا۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے۔ اس لئے ہر شخص پہلی فرصت میں "اپنی تعمیر آپ" کے اصول پر اپنی زندگی کی جدوجہد میں لگ جاتا ہے۔

مگر عجیب بات ہے کہ ملّت کا سوال سامنے آتے ہی تمام لوگ بالکل دوسرے انداز سے سوچنے لگتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ملّت کے مسائل کا تعلق خود ملت سے نہیں بلکہ دوسروں سے ہے۔ اس کا تعلق حکومت سے ہے، انتظامیہ سے ہے، فلاں فلاں متعصب جماعتوں اور گروہوں سے ہے۔ وغیرہ۔

کوئی کہتا ہے کہ ملّی مسئلہ کے ذمہ دار فلاں فلاں سرکاری افسر ہیں، اس لئے ان افسروں کو معطل کراؤ۔ کوئی کہتا ہے کہ حکمراں پارٹی اس کی ذمہ دار ہے، اس لئے الکشن میں اس پارٹی کے امیدواروں کے خلاف ووٹ دے کر انھیں شکست دو۔ کوئی کہتا ہے کہ متعصب جماعتیں اس کی ذمہ دار ہیں، اس لئے اخبار نکال کر ان کے خلاف دھواں دھار مضامین شائع کرو۔

یہ باتیں مضحکہ خیز حد تک غلط ہیں۔ اور اس غلطی کے سب سے بڑے ذمہ دار مسلمانوں کے نام نہاد رہنما ہیں۔ یہ رہنما اپنے ذاتی مسائل کو تو ہمیشہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ حل کرتے ہیں۔ اور ملی مسائل کے بارے میں پرجوش تقریریں کر کے پوری قوم کا مزاج بگاڑ رہے ہیں۔ وہ ملت کے اندر تعمیر کے بجائے احتجاج کا ذہن بنا رہے ہیں۔

کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ ملت کے افراد کو باشعور بنایا جائے۔ ان کے اندر اخلاقی اوصاف پیدا کئے جائیں۔ دوسروں کے خلاف بیان دینے اور تقریر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

ایک تاثر

ایک مجلس میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ ایک مسلمان شاعر نے اپنے نعتیہ کلام سے حاضرین کی تواضع کی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایک قطعہ پڑھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ احد اور احمد دونوں ایک ہیں۔ یہ صرف "م" کا پردہ ہے جس کی وجہ سے دونوں بظاہر الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ جب حشر برپا ہوگا اور حقیقتیں کھلیں گی تو یہ پردہ ہٹ جائے گا، اور پھر دونوں اس طرح ایک جیسے ہو جائیں گے کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھنا مشکل ہوگا۔ ایک شعر یہ تھا:

لوگ محشر میں حیران رہ جائیں گے　　خدا کون ہے، مصطفیٰ کون ہے

اسی طرح ایک مسلمان مقرر کا یہ حال تھا کہ جب وہ تقریر کرتے تو اپنی تقریر سے پہلے یہ جملہ کہتے: "سب کا خدا خدا ہے، میرا خدا احمد" یہ دونوں شعر غالی بدعتی کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر جو لوگ بظاہر اس بدعت سے پاک ہیں، وہ اس سے بھی زیادہ بڑی بدعت میں مبتلا ہیں۔ بدعتیوں نے پیغمبر کو خدا کا درجہ دے رکھا ہے، اور دوسرے مسلمانوں نے اپنے اکابر کو۔ ایک اگر اپنے اس عقیدہ کو زبان قال سے دہرا رہا ہے تو دوسرا زبان حال سے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے بارہ میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ خدا پرست نہیں ہیں بلکہ انسان پرست ہیں۔ ان میں سے کوئی پیغمبر کو خدا کا درجہ دئے ہوئے ہیں اور کوئی غیر پیغمبر کو۔ کوئی اپنے اکابر کی عظمتوں میں کھویا ہوا ہے۔ کسی کو اپنے رہنماؤں کا قد اتنا بڑا دکھائی دیتا ہے کہ اس کے آگے خدائی بلندیاں بھی چھوٹی ہوگئی ہیں۔ کسی کا یہ حال ہے کہ اس کو اپنے بزرگ اتنے زیادہ مقدس نظر آتے ہیں کہ ان پر خالص علمی اور دینی تنقید کرنا بھی کفر و فسق سے کم نہیں۔ حتی کہ ان کے خلاف زبان کھولنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے بعد آدمی کی جان اور مال اور آبرو سب ان کے لئے مباح ہو جائے۔

اگر حقیقت وہی ہو جو قرآن میں بیان کی گئی ہے تو قیامت لوگوں کے تصور سے کتنا زیادہ مختلف ہوگی، لوگ کن کن بڑائیوں میں گم ہیں، مگر جب قیامت آئے گی تو معلوم ہوگا کہ یہاں ایک خدا کے سوا کسی کو کوئی بڑائی حاصل نہ تھی۔ شاعر کا شعر کسی قدر تبدیلی کے ساتھ عین درست ہے:

لوگ محشر میں حیران رہ جائیں گے　　کہ تھی بات کیا، ہم نے سمجھا تھا کیا

غور طلب

یونانی مائتھالوجی میں ایک لعنت زدہ بادشاہ ہے جس کا نام سیسی فس (Sisyphus) ہے۔ اس کو دیوتاؤں نے یہ سزا دی کہ وہ ایک بھاری پتھر کو لے کر پہاڑ پر چڑھے اور اس کو آخری چوٹی پر پہونچائے۔ وہ پتھر کو لے کر پہاڑ پر چڑھتا ہے۔ مگر اس پر ایک مزید لعنت ہے۔ چنانچہ جب وہ چوٹی کے قریب پہونچتا ہے تو پتھر اس سے چھوٹ کر نیچے کی طرف لڑھک پڑتا ہے۔ بادشاہ دوبارہ نیچے اترتا ہے اور دوبارہ پتھر کو لے کر اوپر چڑھنا شروع کرتا ہے۔ مگر دوبارہ ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ پہاڑ کی چوٹی کے قریب پہونچتا ہے تو پتھر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر جاتا ہے۔ یہی صورت بار بار پیش آتی ہے اور بادشاہ کبھی پتھر کو لے کر چوٹی تک نہیں پہونچ پاتا۔ اس بنا پر اس کی لعنت بھی اس سے رفع نہیں ہوتی:

In Greek mythology, there is a tragic legend of Sisyphus who was awarded the punishment of rolling a huge stone up a hill to the top. But there was an additional curse on him that just before reaching the top, the stone would constantly roll down and his everlasting labour would begin again and again.

"بالاکوٹ کے معرکہ" کے بارہ میں ایک مسلمان مصنف لکھتے ہیں کہ "اس معرکہ میں وہ پاک نفوس شہید ہوئے جو عالم انسانیت کے لیے رونق تھے۔ انسانیت اور اسلام کے باغ کا ایسا عطر مجموعہ صدیوں سے تیار نہیں ہوا تھا، اور جو ساری دنیا کو معطر کرنے کے لیے کافی تھا۔ ۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ کو وہ بالاکوٹ کی مٹی میں مل گیا۔ مسلمانوں کی نئی تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔"

موجودہ زمانہ میں جو بڑی بڑی مسلم تحریکیں اٹھیں، ان کے احوال پڑھیے تو تقریباً بلا استثناء ہر ایک کے یہاں یہی لکھا ہوا ملے گا کہ ہم تو کامیابی کی چوٹی کے بالکل قریب پہونچ گیے تھے۔ مگر عین وقت پر فلاں شخص کی سازش نے سارا معاملہ بگاڑ دیا اور کفر و الحاد کا قلعہ فتح ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ان تحریکوں کا یہ بیان ایک قاری کو اس شبہہ میں ڈالتا ہے کہ کہیں موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کا معاملہ وہ تو نہیں جو یونانی دیومالا میں سیسی فس کا بتایا گیا ہے۔

برائے اعزاز

ہندستان کی سابق خاتون وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے "غریبی ہٹاؤ" کا نعرہ لگایا۔ اس کے لئے انھوں نے دھواں دھار تقریریں کیں۔ ہوائی جہازوں پر سارے ملک کے دورے کئے۔ مگر اندرا گاندھی کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ وہ ملک کے غریبوں کے لئے کوئی حقیقی عملی کام کریں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ "غریبی ہٹاؤ" کا نعرہ انھیں ملک کا وزیر اعظم بنا رہا تھا، جب کہ غریبی ہٹانے کے خاموش عمل میں نتیجہ اس کے برعکس نکلتا۔ وہ وزارت عظمیٰ کی کرسی بھی کھو دیتیں اور اسی کے ساتھ موجودہ ملی ہوئی عزت اور عظمت بھی۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کا حال بھی یہی ہے۔ ان کے اندر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا بہت جوش ہے۔ مگر انھیں صرف اس خدمت سے دلچسپی ہے جو انھیں مقام اعزاز پر بٹھانے والی ہو۔ اسلام اور مسلمانوں کی ایسی خدمت جس میں کوئی اعزاز نہ ملے بلکہ وہ ساری قوم کے درمیان نکو بن کر رہ جائیں، ایسی خدمت سے اور ایسے میدان میں سرگرم ہونے سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔

یہی وہ صورت حال ہے جس کی بابت قرآن میں کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کو اور ایمان لانے والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، مگر وہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے (البقرہ ۹)

یہ خود فریبی کی بدترین قسم ہے۔ یہ لوگ بظاہر اپنے آپ کو خادم اسلام اور خادم ملت کی حیثیت سے نمایاں کر رہے ہیں۔ مگر ان کا یہ تضاد ان کی اصل حقیقت کو بتا رہا ہے کہ وہ اعزاز کے مقامات پر تو خوب متحرک ہوتے ہیں مگر جہاں دنیوی اعزاز ملنے کی امید نہ ہو وہاں بے حس اور غیر جانبدار بنے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ کچھ انسانوں کو وقتی طور پر غلط فہمی میں مبتلا کر سکتے ہیں، مگر وہ اللہ عالم الغیب کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ انھیں جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ان کی حقیقت کے اعتبار سے ان کے ساتھ معاملہ کرے گا نہ کہ ان کے ظاہر کے اعتبار سے۔

جوابی مذہبیت

مئی ۱۹۲۲ کا واقعہ ہے۔ لاہور کے شاہ عالمی دروازہ کے باہر ہندوؤں نے ایک مندر تعمیر کیا۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں کے اندر یہ جذبہ جاگ اٹھا کہ مندر کے ساتھ مسجد بھی ہونا چاہئے۔ جس فضا میں مندر کے کلس چمک رہے ہیں وہاں مسجد کے مینار کی عظمت بھی دکھائی دینا ضروری ہے۔ چنانچہ فوراً چندہ ہوا اور مندر کے پاس ایک زمین مسجد کے لئے حاصل کی گئی۔ نماز عشار کے بعد اس مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ ساری رات کام ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ جب صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ مندر کے مقابلہ میں ایک مسجد بنی ہوئی کھڑی ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس سے متاثر ہو کر ڈاکٹر محمد اقبال نے اپنا یہ مشہور شعر کہا تھا:

مسجد تو بنا لی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

یہ ایک علامتی واقعہ ہے جو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بیشتر سرگرمیوں پر چسپاں ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہماری اکثر دینی سرگرمیاں حقیقۃً جوابی سرگرمیاں ہیں۔ ان کا اصل محرک کسی غیر قوم کا کوئی عمل ہے نہ کہ حقیقۃً خدا اور رسول کا حکم۔

اس قسم کی مذہبیت جوابی مذہبیت ہے۔ وہ قومی محرک کے تحت پیدا ہوتی ہے نہ کہ خدائی محرک کے تحت۔ چنانچہ مسلمانوں نے مادی اور جغرافی اور سیاسی اسباب کے تحت دیگر اقوام کو اپنا حریف سمجھ لیا ہے۔ وہ ان کو نیچا دکھا کر اپنے لئے قومی تسکین حاصل کرتے ہیں ——— ایسی تمام کارروائیاں بلاشبہ قومی کارروائیاں ہیں، خواہ بظاہر ان کو مذہب کے لباس میں کیوں نہ پیش کیا گیا ہو۔

مومن وہ ہے جو خدا سے ڈرے۔ جس کی تمام سرگرمیاں خدا کے زیر اثر انجام پاتی ہوں۔ اس کا رکنا خدا کے لئے ہوتا ہو اور ٹھہرنا خدا کے لئے۔ جو کام اس طرح کے جذبات کے ساتھ کیا جائے اس کے ساتھ خدا کی مدد شامل رہتی ہے۔ وہ مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔ مگر جو کام دوسری قوموں کی ضد میں کیا جائے اس سے صرف نفرت اور کش مکش بڑھے گی۔ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ صورت حال مزید پیچیدہ ہوتی چلی جائے اور کبھی وہ حسن خاتمہ تک نہ پہنچے۔

فطرتِ انسانی

یہاں ہم دو تصویریں نقل کر رہے ہیں۔ دونوں بظاہر سجدہ کی تصویریں ہیں۔ مگر یہ "فطرت" کا سجدہ ہے نہ کہ "شریعت" کا سجدہ۔ یہ دونوں امریکہ کے دو کھلاڑیوں کی تصویریں ہیں۔ ان کی زندگی میں وہ نازک موقع آیا جب کہ انھوں نے فطرت کی سطح پر اس گہرے احساس کا تجربہ کیا جس کو مذہب کی اصطلاح میں "عبودیت" کہا جاتا ہے۔ اس احساس سے مغلوب ہو کر وہ زمین پر گر پڑے اور سجدہ کی حالت میں جا کر اپنے اندرونی جذبہ کی تسکین حاصل کی۔

10 THE TIMES OF INDIA, TUESDAY, JUNE 26, 1984

Carl Lewis kisses the track after winning the 200 meters at the recent U.S. Track and Field trials. With victory Lewis assured himself of a crack at Jesse Owens' record of four gold medals at the Berlin Olympics in 1936. Lewis had earlier qualified for the 100 meters, the long jump and the 4 x 100 meters relay. AP.

سجدہ فطرتِ انسانی کی طلب ہے۔ اس طلب کا حقیقی جواب یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اپنے خالق و مالک کے آگے جھکا دے۔ مگر انسان اپنی بے خبری کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسری دوسری چیزوں کے آگے جھکاتا ہے، جو چیز صرف ایک خدا کا حق ہے اس کو وہ غیر خدا کو دے دیتا ہے۔

پہلی تصویر امریکی کھلاڑی کارل لیویس کی ہے۔ لاس اینجلس میں دوڑ کا عالمی مقابلہ ہوا۔ اس میں ۲۲ جون ۱۹۸۴ کو کارل لیویس نے اعلیٰ کامیابی حاصل کی۔ اس کامیابی کے بعد کارل لیویس کی ایک تصویر اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اس تصویر کا عکس ہم مقابل کے صفحہ پر نقل کر رہے ہیں۔

اس تصویر میں کارل لیویس بالکل سجدہ کی حالت میں دکھائی دے رہا ہے جس پٹڑی پر دوڑ کر اس نے یہ مقابلہ جیتا تھا، اس پٹڑی کے لئے اس کے دل میں عقیدت اور احسان مندی کا اتنا شدید جذبہ پیدا ہوا کہ پٹڑی پر اپنی پیشانی رکھ کر وہ سجدہ میں گر پڑا۔

یہ ایک تازہ مثال ہے جو بتاتی ہے کہ انسانی فطرت میں کس طرح یہ جذبہ چھپا ہوا ہے کہ وہ کسی کو اپنا محسن سمجھے اور اس کے آگے اپنے بڑھے ہوئے جذباتِ عقیدت کو پیش کر سکے۔

یہ مثال وہ تھی جب کہ احساس شکر کے تحت آدمی زمین پر گر پڑتا ہے۔ اب دوسری مثال لیجئے جس میں احساسِ عجز نے انسان کو مجبور کیا کہ وہ زمین پر اپنا سر رکھ دے۔ یہ مثال ۲۹ سالہ جان میک انرو کی ہے۔ وہ امریکہ کے رہنے والے ہیں۔ وہ ۱۹۸۱ سے بیڈمنٹن کے عالمی چمپین تھے۔ ۲۴ جون ۱۹۸۸

THE HINDUSTAN TIMES, NEW DELHI, SATURDAY JUNE 25 1988

DOWN AND OUT ... Former champion, John McEnroe is floored in his match against Wally Masur of Australia in the Wimbledon championships on Thursday. Wally Masur won 7-5, 7-6 (7-5), 6-3. — PTI photo.

کو ان کا مقابلہ آسٹریلیا کے ۲۵ سالہ والی ماسور سے لندن میں ہوا۔ اس مقابلہ میں جان میک انرو کو شکست ہوئی۔ ان کی عالمی چیمپین کی حیثیت ختم ہوگئی (ہندستان ٹائمس۔ ۲۵ جون ۱۹۸۸)

جان میک انرو پر اس واقعہ کا زبردست اثر پڑا۔ تاہم انھوں نے اپنی شکست کی ساری ذمہ داری خود قبول کی۔ انھوں نے کہا کہ میں بالکل بنیادی تقاضے بھی پورے نہ کرسکا۔ اس نے مجھے بیمار بنا دیا :

I couldn't even do the basics.
It almost made me sick.

اس سلسلہ میں اخبارات میں جو رپورٹ شائع ہوئی ہے، اس میں جان میک انرو کی ایک تصویر بھی شامل ہے۔ اس تصویر میں سابق چیمپین بالکل سجدہ کی حالت میں زمین پر گرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ دراصل انسانی عجز کا اعتراف ہے۔

یہ دونوں جذبات (احساسِ شکر اور احساسِ عجز) انسانی فطرت کے نہایت گہرے جذبات ہیں۔ اس دنیا میں انسان کبھی پاتا ہے اور کبھی کھوتا ہے۔ کبھی کامیاب ہوتا ہے اور کبھی ناکام۔ انسان جب کامیاب ہوتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کامیابی کو کسی کا عطیہ قرار دے کر اس کا شکر ادا کرے۔ اسی طرح جب وہ ناکام ہوتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ یہاں کوئی اور طاقت ہے جو سب کے اوپر ہے۔ یہ جذبہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس قادرِ مطلق کے آگے جھک جائے۔

یہ جذبات انسانی فطرت کے نہایت گہرے جذبات ہیں۔ کوئی بھی انسان ان سے خالی نہیں۔ خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، امیر ہو یا غریب۔ انسانی فطرت کا علمی مطالعہ کرنے والے ماہرین نے اعتراف کیا ہے کہ یہ جذبات انسانی فطرت میں اس طرح پیوست (Interwoven) ہیں کہ ان کو کسی بھی طرح انسان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ جذبہ دراصل خدا کی پرستش کا جذبہ ہے۔ اس جذبہ کا مرجع حقیقۃً وہ ہستی ہے جو انسان کی خالق ہے۔ یہ جذبہ اس لئے ہے کہ انسان اپنے خالق و مالک کو پہچانے۔ وہ اس کی عظمت کا اعتراف کرے وہ اس کے آگے اپنے آپ کو ڈال دے۔

مگر انسان فطرت کے راستہ سے انحراف کرتا ہے۔ جو چیز خدا کو دینا چاہئے وہ اسے دوسروں کو دیتا

ہے۔ اسی کا دوسرا نام شرک ہے۔ آدمی اگر اپنے فطری جذبات کا مرجع ایک خدا کو بنائے تو یہ توحید ہے اور اگر وہ ان کا مرجع کسی دوسری زندہ یا مردہ چیز کو بنائے تو یہ شرک ہے۔ توحید انسانی فطرت کا صحیح استعمال ہے اور شرک انسانی فطرت کا غلط استعمال۔

انسان عین اپنی فطرت کے زور پر مجبور ہے کہ وہ کسی کو اپنا "خدا" بنائے۔ حقیقی خدا چوں کہ ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا اس لئے وہ دکھائی دینے والی چیزوں کو خدا سمجھ لیتا ہے۔ جو کچھ خدا کو دینا چاہئے وہ اسے غیر خدا کو دے دیتا ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ انسانی فطرت کوئی چیز نہیں۔ یہ صرف خارجی حالات ہیں جو انسان کی صورت گری کرتے ہیں۔ مگر جدید تحقیقات اس نظریہ کو غلط ثابت کر رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم ایک امریکی تحقیق کا حوالہ دیتے ہیں جس کا خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں شائع ہوا ہے:

NATURE BEATS NURTURE

Karl Marx and Sigmund Freud were wrong about human nature. Contrary to their view, inherited qualities are far more important than upbringing in determining personality, a team of psychologists has concluded. In an eight year study at the University of Minnesota involving 350 pairs of twins, 44 of them identical, the scientists found that the influence of genes was clearly victorious in the 'nature versus nurture' dispute. The results of their research will be seen as refuting Marxist dogma that insists that man can be 'remade.' 'In particular, we found that the tendency to believe in traditional values and the strict enforcement of rules is more an inherited trait,' said one of the researchers, Dr David Lykken.

The Hindustan Times, Sunday Magazine, January 4, 1987.

کارل مارکس اور سگمنڈ فرائڈ انسانی فطرت کے بارے میں غلطی پر تھے۔ ان کے نقطۂ نظر کے برعکس، انسانی شخصیت کی تشکیل میں تربیت کے مقابلہ میں اندرونی پیدائشی صفات کہیں زیادہ اہم ہیں۔ نفسیاتی ماہرین کی ایک ٹیم نے اس نتیجہ کا اعلان کیا ہے۔ منی سوٹا یونیورسٹی کے تحت کیے جانے والے ۸ سالہ مطالعہ میں، جس میں ۳۵۰ توأم جوڑے شامل تھے، اس میں ۴۴ بالکل یکساں قسم کے تھے، سائنس دانوں نے پایا ہے کہ جینز کا اثر فطرت بمقابلہ تربیت کی بحث میں واضح طور پر غالب رہا۔ ان کی تحقیق کے نتائج مارکس کے اس مفروضہ کی تردید ہیں جس کا شدت سے یہ دعوی

ہے کہ انسان کو دوبارہ بنایا جاسکتا ہے۔ ریسرچ ٹیم کے ایک شخص ڈاکٹر ڈیوڈ لکن نے کہا کہ ہم نے یہ پایا ہے کہ روایتی قدروں میں عقیدہ اور قانون کے سختی سے نفاذ کا رجحان زیادہ تر پیدائشی صفات کا نتیجہ ہے۔

مذکورہ واقعہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات سے، یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک برتر ہستی (خالق) کے آگے سپردگی کا جذبہ ایک فطری اور حقیقی جذبہ ہے۔ اگر وہ غیر فطری اور غیر حقیقی ہوتا تو اس کو اب تک ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ جدید نسل ایسے حالات میں پرورش پاکر نکلی ہے جب کہ اس کے ہر طرف لامذہبیت اور بے خدا تہذیب کا چرچا تھا۔ اس کے باوجود نئی نسل میں یہ مذہبی نفسیات مسلسل طور پر باقی رہی، وہ کسی طرح ختم نہ کی جاسکی۔

سیول (کوریا) میں ستمبر ۱۹۸۸ میں کھیلوں کے اولمپک مقابلے ہوئے۔ اس سلسلہ میں اخبارات میں روزانہ باتصویر رپورٹیں آرہی تھیں۔ انھیں میں سے ایک تصویر وہ تھی جو ۳۰ ستمبر کے اخبارات میں شائع ہوئی۔ آپ ٹائمس آف انڈیا (۳۰ ستمبر ۱۹۸۸) کا صفحہ ۱۰ دیکھیں۔ وہاں ایک عورت آپ کو عین نماز کی حالت میں نظر آئے گی۔ یعنی وہ حالت جو نماز کے خاتمہ پر کسی نمازی کی ہوتی ہے۔ اس تصویر میں مذکورہ عورت بالکل نماز کی ہیئت میں دونوں پاؤں توڑ کر بیٹھی ہوئی ہے۔ اور اپنے ہاتھوں کو اٹھا کر منھ کے پاس اس طرح کیے ہوئے ہے جیسے وہ نماز سے فارغ ہو کر دعا میں مشغول ہو۔

یہ کوئی نمازی عورت نہیں ہے۔ یہ کیلی فورنیا کی ایک ۲۷ سالہ کھلاڑی خاتون ہے جس کا نام فلارنس گریفتھ جائز (Florence Griffith-Joyner) ہے۔ ۲۹ ستمبر کو ۲۰۰ میٹر کی دوڑ میں اس نے گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اور دنیا کی تیز ترین عورت (Fastest woman) قرار دی گئی۔ اس کامیابی کی خبر نے اس کی اندرونی ہستی کو بے قرار کر دیا۔ وہ ابھی اپنے کھیل کے لباس ہی میں تھی کہ وہ زمین پر گر پڑی۔ وہ بے اختیارانہ طور پر نمازی کی ہیئت میں بیٹھ گئی اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعا کرنے لگی اور اس کے سامنے اظہار جذبات میں مشغول ہو گئی۔

یہ واقعہ اس بات کا ایک اظہار ہے کہ انسان کی فطرت میں ایک محسن اور منعم کا تصور نہایت گہرائی کے ساتھ چھپا ہوا ہے۔ آدمی کو جب کوئی غیر معمولی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو اس کا اندرونی جذبہ بے اختیارانہ طور پر چاہنے لگتا ہے کہ وہ اس کے آگے جھک جائے، وہ اس احسان کو حقیقی

محسن کے خانہ میں ڈال دے۔

بے چین روح

بلیر فاولر (پیدائش ۱۹۲۱) امریکہ کے ایک راکٹ انجنیر ہیں۔ وہ اعلیٰ قابلیت کے ان انجنیروں میں شامل تھے جن کی کوششوں نے آخر کار سیٹرن راکٹ کی شکل اختیار کی۔ جنوری ۱۹۸۶ میں بلیر فاولر چند دن کے لیے نئی دہلی آئے۔ یہاں انھوں نے تاج پیلس (ہوٹل) میں ہندستان ٹائمس کے نمائندہ سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ان کی زندگی اب ایک مکمل تبدیلی سے دوچار ہو چکی ہے۔ ان کی بیوی ایک کامیاب میڈیکل ڈاکٹر تھیں۔ اور وہ خود اپنے کیریر کی چوٹی پر پہونچ چکے تھے کہ دس سال پہلے دونوں نے اپنا اپنا کام یک لخت چھوڑ دیا۔

اس کے بعد وہ دونوں شہر سے باہر کیلی فورنیا کے ایک معمولی فارم میں چلے گیے۔ یہاں وہ دونوں بالکل سادہ قدیم دیہاتی انداز میں زندگی گزارتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھ سے لکڑی کاٹتے ہیں۔ لکڑی کی آگ پر خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے ہیں۔ وہ مشینی دنیا سے بھاگ کر فطرت کی دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں اور اپنی اس سادہ زندگی پر بالکل خوش ہیں۔ انھوں نے کیوں ایسا کیا۔ مسٹر بلیر فاولر کے الفاظ میں، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہمارا علم جتنا ترقی کرتا ہے اتنا ہی ہم کو اپنی جہالت کا احساس ہوتا ہے:

As our knowledge grows the more one gets convinced that he is ignorant.

انھوں نے علم کی دنیا میں اپنا سفر شروع کیا تھا۔ مگر آخر کار انھیں معلوم ہوا کہ ان کا ہر اگلا قدم صرف جہالت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ انسانی علم آدمی کو حقیقی علم تک نہیں پہونچاتا۔

مزید یہ کہ مذکورہ سائنسی ماحول میں ان کو روحانی سکون حاصل نہ تھا۔ بلیر فاولر کو ایک ایسے احاطہ میں کام کرنا پڑتا تھا جس کے چاروں طرف چار فیٹ کی مضبوط دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کا کام یہ تھا کہ ہائیڈروجن گیس کو رقیق ہائیڈروجن میں تبدیل کریں۔ اس کے لیے بڑے سخت حالات میں کام کرنا پڑتا ہے۔ نیز ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ گیس کا ذخیرہ پھٹ نہ جائے۔ یہ صورت حال ایک مستقل ذہنی تناؤ کا باعث بنی رہتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا سے کمتر کوئی چیز انسان کو سکون عطا نہیں کر سکتی۔ خواہ وہ سائنسی علوم ہوں یا مادی اور مشینی ترقیاں۔

Total change

NEW DELHI, Jan. 27 — "As our knowledge grows the more one gets convinced that he is ignorant" says Blair Fowler, an aero-jet engineer who worked on the first liquid propulsion rocket in the United States that ultimately became the Saturn rocket with several million pounds thrust.

On a brief holiday in India, Mr. Fowler told this correspondent at the Taj Palace, New Delhi that his life had now undergone a total change. At the peak of his career ten years ago he and his wife, who too had a prosperous medical practice, simply gave up their jobs and money and retired to a Californian ranch "to work with our bare hands"

Mr Fowler holds out his hands, now toughened and also rough by physical work like wood cutting, carpentry, blacksmithy, etc. "When I was in the rocket propulsion group my hands had become soft through constant paper work designing and redesigning."

At 65, Mr Fowler looks quite young and strong. "We do a lot of wood cutting for firewood in our home which is heated by log fire". There is a furnace and forge also in his ranch where he hammers iron into shape like the blacksmiths used to do in the olden days.

Looking back at the development in rocketry which now has put man on the moon and done several extraordinary things, this aero-engineer recalls the way they worked to develop the liquid hydrogen and oxygen burning rocket motor under Theodore Von Carman, a well known rocket expert.

There were no electronic instruments at that time even though they had to work with pumps with speeds of 40,000 rpm. Kryogenics, the science of supercooling, was still in its infancy. How liquid hydrogen and oxygen would behave was also not known.

They worked behind three feet concrete walls and lived in constant fear of explosion. In fact there was one such explosion "but we escaped". To obtain even a few litres of liquid hydrogen, repeated cooling using liquid nitrogen and dripping techniques under high vacuums had to be utilised. "We le: nt later that the Soviet scientist Kapista was also developing these engines parallely." Subsequently, Mr Fowler worked on nuclear rocket development but the project was given up as unpracticable.

Why did he and his wife give up their practice and money to go back to ranch life? He says: "Though we were quite well off, we were not living, each one busy in his own work. We did not have time to talk to each other. Today we are a happy couple as we share our work. My wife kneads the dough and bakes the bread and we have much time for mutual communication".

Mr Fowler is very much influenced by Gandhian thinking like hard physical work and its elevating nature, the need for man to be self-sufficient and simple living. He thinks that there is lot of sense in that philosophy.

The Hindustan Times, January 28, 1986

امریکہ کے ایک کروڑپتی کے بارہ میں ایک خبر پڑھی۔ خبر کا عنوان تھا اکتا کر جان دیدی (Bored To Death) اس عنوان کے نیچے خبر کے الفاظ یہ تھے :

The millionaire was tired, weary and bored. He called for his Lincoln continental limousine, got in, and said to the chauffeur: "James, drive full speed over the cliff. I've decided to commit suicide."

کروڑپتی تھکا ہوا تھا۔ وہ افسردہ اور اکتایا ہوا تھا۔ اس نے اپنی قیمتی کار منگوائی۔ اس کے اندر بیٹھا۔ اور شوفر سے کہا "جیمز، ڈھلوان کے اوپر پوری رفتار سے گاڑی دوڑاؤ۔ میں نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا ہے" (ٹائمس آف انڈیا ۲۶ فروری ۱۹۸۵)

جن لوگوں کے پاس پیسہ کم ہو وہ بہت سے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ مسائل وہی ہیں جو پیسہ کی کمی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ان کے پاس پیسہ زیادہ آجائے تو ان کے تمام مسائل ختم ہوجائیں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جس طرح پیسہ کی کمی کے مسائل ہیں اسی طرح پیسہ کی زیادتی کے بھی مسائل ہیں۔ جس شخص کے پاس پیسہ کی افراط ہوجائے اس کے پاس مسائل کی بھی افراط ہوجاتی ہے حتی کہ اس کو سکون کے ساتھ رات کے وقت سونا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔

اس دنیا میں پرسکون زندگی کا راز صرف ایک ہے۔ اور وہ وہی ہے جس کو مذہب کی زبان میں قناعت کہا جاتا ہے یعنی جو کچھ خدا نے دیا ہے اس پر صابر و شاکر رہنا۔ عدم اطمینان دراصل عدم قناعت کی نفسیاتی قیمت ہے۔ جو ہر اس آدمی کو بھگتنی پڑتی ہے جو خدا کی تقسیم پر راضی نہ ہو۔

عام انسان صرف یہ جانتا ہے کہ اس کا مصرف یہ ہے کہ وہ دولت کمائے۔ حالانکہ اگر دولت کمانا سب کچھ ہو تو دولت مند آدمی کبھی کسی مسئلہ سے دوچار نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت حاصل کرنے سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ زندگی کا علم حاصل کیا جائے۔ آدمی کو جینا آجائے تو وہ ہر حال میں سکون کے ساتھ جی سکتا ہے خواہ اس کے پاس کم پیسہ ہو یا زیادہ پیسہ۔

مٹانے کے بعد بھی

۹ ستمبر ۱۹۸۸ کو نئی دہلی میں اخبار نیشنل ہیرالڈ کی گولڈن جوبلی کی تقریب تھی۔ اس موقع پر وزیر اعظم راجیو گاندھی نے ایک تقریر کی۔ چوں کہ انھیں دنوں ملک میں ہتک عزت بل کے خلاف ایجی ٹیشن چل رہا تھا، کچھ لوگ مذکورہ تقریب میں بھی پہنچ گئے اور وہاں انھوں نے ہتک عزت بل کے خلاف نعرے لگائے، کیوں کہ وہ لوگ اس بل کو پریس کی آزادی ختم کرنے کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔

اسی دن شام کو دور درشن (T.V.) پر حسب معمول وزیر اعظم کی باتصویر خبر نشر کی گئی۔ اس نشریہ کے دوران مظاہرہ کرنے والوں کی تصویریں اور ان کے نعرے بھی دور درشن دیکھنے والوں کے سامنے آگئے۔ یہ وزیر اعظم کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ چنانچہ ۱۲ ستمبر کو ایک سرکاری حکم جاری کیا گیا جس کے تحت دور درشن کے کیمرہ یونٹ کے تین آدمی (من موہن سنگھ، جیون ڈوگرہ، ڈی کے ڈے) زیر عتاب آگئے۔ اول الذکر دو کو جے پور بھیج دیا گیا اور تیسرے صاحب کا شعبہ تبدیل کر دیا گیا۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۵ ستمبر ۱۹۸۸) کے مطابق، وزیر اعظم کے دفتر کی طرف سے یہ سخت اقدام اس واقعہ کی بنا پر کیا گیا کہ دور درشن میں ہتک عزت بل کے خلاف نعرے سنائی دے رہے تھے:

. . . the Anti-Defamation Bill slogans were heard over Doordarshan.

ایک شخص جس کو صرف "ٹیلی وژن" کی آواز (۱) اور تصویروں کا علم ہو وہ وہی کرے گا جو وزیر اعظم نے کیا۔ مگر جو شخص اس حقیقت کو جانے کہ ہر انسانی آواز ٹیلی وژن پر ریکارڈ ہونے سے پہلے خدا کے کائناتی ریکارڈ پر ثبت ہو چکی ہے، وہ اس قسم کی کارروائی کو طفلانہ سمجھے گا، کیونکہ ٹیلی وژن ریکارڈ پر مٹانے کے بعد بھی اس کا علم کہے گا ——— نعروں کی آواز تو اب بھی سنائی دے رہی ہے۔ ٹی وی کی فلم سے تصویروں کو مٹانے کا کیا فائدہ، کائنات کی وسیع تر فلم پر تو تمام تصویریں بدستور موجود ہیں۔

نقصان در نقصان

مولانا اختر احسن اصلاحی (وفات ۱۹۵۷) مدرسۃ الاصلاح کے صدر مدرس تھے۔ ایک بار انھوں نے ایک مسلمان عالم کا نام لے کر کہا کہ وہ عربی زبان پر نہایت عمدہ قدرت رکھتے ہیں۔ اور فلاں عرب سفارت خانہ میں کام کرتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں ان کو ادب عربی کے استاد کی حیثیت سے اپنے مدرسہ میں بلاؤں۔ مگر میں ان کو سفارت خانہ والی تنخواہ نہیں دے سکتا۔ اس لیے میں اپنے مدرسہ کے لیے ان کو حاصل بھی نہیں کر سکتا۔

یہ بات چالیس پہلے کی ہے۔ اب یہ صورت حال چالیس گنا سے بھی زیادہ بڑھ چکی ہے۔ آج ہماری تمام بہترین صلاحیتیں اغیار کے قبضہ میں ہیں۔ مسلم اداروں کو ان کا کوئی حصہ حاصل نہیں۔

تیسری دنیا (Third world) کی اصل کمزوری یہ ہے کہ اس میں سب تیسرے درجہ کے لوگ بھرے ہوئے ہیں۔ یہاں جتنے اعلیٰ درجہ کے افراد تھے، اور جو اونچی تعلیم پائے ہوئے تھے، وہ ملینوں (Millions) کی تعداد میں یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں جاکر آباد ہو گیے ہیں۔ کیوں کہ وہاں ان کو زیادہ پیسہ اور زیادہ بہتر مواقع حاصل ہیں۔ یہی تمام مسلم قوموں کا حال ہے۔ اور یہی غیر مسلم اقوام کا حال بھی۔

ہندستان اور پاکستان کے مسلم اداروں کو دیکھیے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ان اداروں کی کارکردگی اچھی نہیں۔ ان اداروں میں کام کا وہ معیار نہیں رہا جو پہلے وہاں پایا جاتا تھا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اعلیٰ ذہن تقریباً سب کے سب بیرونی ملکوں میں چلے گیے۔ اب صرف کم تر صلاحیت کے لوگ باقی رہ گیے ہیں جو مسلم اداروں کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اور جن اداروں میں کمتر صلاحیت کے لوگ بھرے ہوئے ہوں ان کی کارکردگی کا معیار کمتر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اعلیٰ کام ہمیشہ اعلیٰ آدمی کرتے ہیں۔ جب اعلیٰ آدمی ہی نہ رہیں تو اعلیٰ کام کیسے ہو سکتا ہے۔

اس صورت حال کا سب سے زیادہ عبرت ناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے اکابر سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت تک مغربی اقوام کو سب سے بڑی لعنت بتاتے رہے۔ انھوں نے ملت کے تمام بہترین وسائل اس محاذ پر لگا دیے کہ ان بیرونی اقوام کی غلامی سے ملت کو رہائی دے سکیں۔ مگر جب

ناقابل بیان قربانیوں کے بعد بیرونی قومیں ہمارے ملکوں سے واپس چلی گئیں تو اب یہ حال ہے کہ ہمارے تمام بہترین افراد اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر خود مغربی ملکوں میں پہونچ گیے اور اب وہ انھیں قوموں کے زیر سایہ زندگی گزارنے کو فخر سمجھ رہے ہیں جن کو ان کے اکابر نے اسلام اور مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی لعنت قرار دیا تھا۔ کیسے عجیب تھے یہ اکابر اور کیسے عجیب ہیں اکابر کے یہ اخلاف۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان ترقی اور کامیابی چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کو انسان کے اندر سے کبھی ختم نہیں کیا جاسکتا۔ ماضی کے رہنماؤں نے اگر ایسا کیا ہوتا کہ جن بے شمار وسائل کو وہ مغربی قوموں کے خلاف لڑائی میں استعمال کرتے رہے ان کو وہ خود اپنے ملک کی علمی اور تمدنی ترقی میں استعمال کرتے تو دردناک مہاجرت کا یہ واقعہ، کم از کم اتنے بڑے پیمانہ پر ہرگز پیش نہ آتا۔ ایسی صورت میں حوصلہ مند افراد خود اپنے ملک میں وہ مواقع پالیتے جن کو استعمال کرکے وہ اعلیٰ ترقی حاصل کرسکیں۔

تیسری دنیا میں آزادی عمل کے مواقع نہ ہونا۔ اعلیٰ معیار کے تعلیمی اداروں کا فقدان، اپنے حوصلوں کے مطابق ترقی کے راستہ میں بڑھتے رہنے والے حالات کی غیر موجودگی، یہ وہ چیزیں ہیں جو اس واقعہ کو ظہور میں لارہی ہیں جس کو مشرقی ذہن کا مغربی دنیا کی طرف نکاس (Brain drain) کہا جاتا ہے۔

اجتماعی حالات بے حد نازک ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ بے شمار پیچیدگیاں وابستہ ہوتی ہیں۔ اجتماعی زندگی میں کوئی اصلاحی کام کرنا الجھے ہوئے دھاگے کو سلجھانے کے ہم معنی ہے۔ ایسی حالت میں جو لوگ اجتماعی زندگی میں لغزوں کی سیاست لے کر کھڑے ہوجائیں وہ یا تو حد درجہ غیر سنجیدہ ہیں یا حد درجہ نادان۔

حقیقت بے نقاب

بابری مسجد کی بازیابی کے لئے "اجودھیا مارچ" کی تحریک طوفان کی طرح اٹھی اور غبارہ کی طرح پھٹ گئی۔ بظاہر یہ ایک المناک حادثہ تھا۔ تاہم اطمینان کی بات یہ ہے کہ جو غبارہ پھٹا، وہ نام نہاد مسلم قیادت کا غبارہ تھا۔ ملت ابتدائی طور پر قائدین کا ساتھ دینے کے بعد آخر کار ان سے الگ ہوگئی، اور اس طرح وہ ان قائدین کے فتنہ سے بچ گئی جو اس کو حوالہ آتش کرکے اپنے جھوٹے قیادتی چہرہ کو روشن کرنا چاہتے تھے۔

بابری مسجد کا قضیہ بہت پرانا ہے۔ وہ تقسیم (۱۹۴۷) کے قبل سے چلا آرہا ہے۔ تاہم پر امن تدبیر کے دائرہ سے نکل کر ایجی ٹیشن کے دائرہ میں داخل ہونے کا دور ۱۹۸۷ کی ابتدا سے شروع ہوتا ہے۔ کچھ نام نہاد مسلم لیڈروں نے بابری مسجد کی بازیابی کے نام پر ۲۶ جنوری ۱۹۸۷ کو ریپبلک ڈے کے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔ یہ اس معاملہ میں غیر پر امن انداز اختیار کرنے کا آغاز تھا۔ تاہم یہ لغو اقدام اخباری گرمی پیدا کرنے کے بعد آخر وقت میں واپس لے لیا گیا۔

اس کے بعد ۳۰ مارچ ۱۹۸۷ کو "لاکھوں" مسلمانوں کی ریلی نئی دہلی (بوٹ کلب) میں جمع ہوئی۔ یہاں نہایت اشتعال انگیز تقریریں ہوئیں اور "بابری مسجد لیکے رہیں گے" جیسے پرجوش نعرے لگائے گئے۔ (ملاحظہ ہو الرسالہ نومبر ۱۹۸۸، صفحہ ۲۴) لیڈروں نے اپنی دھواں دھار تقریروں کے دوران اعلان کیا کہ وہ مارچ کرکے اجودھیا جائیں گے اور مسجد میں فاتحانہ داخل ہوکر وہاں جمعہ کی نماز ادا کریں گے۔ اس کے بعد دسمبر ۱۹۸۷ کی میٹنگ میں دو مارچ کا فیصلہ کیا گیا:

۱. قائدین کا رمنی مارچ — ۱۲ اگست ۱۹۸۸

۲. مسلم عوام کا لانگ مارچ — ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸

اعلان کے مطابق دونوں مارچ فیض آباد سے شروع ہوکر اجودھیا کی بابری مسجد پر ختم ہونے والا تھا۔ پہلا مارچ تقریباً پانچ سو کی تعداد میں قائدین اور مسلم نمائندوں پر مشتمل ہوتا اور دوسرے مارچ میں سارے ملک کے مسلم عوام لاکھوں کی تعداد میں فیض آباد میں جمع ہوتے اور وہاں سے یلغار کرتے ہوئے اجودھیا پہنچتے اور بابری مسجد میں داخل ہو جاتے۔

مگر عملاً نہ منی مارچ ہو سکا اور نہ لانگ مارچ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ادھر مسلم قائدین کی طرف سے اجودھیا مارچ کا اعلان ہوا۔ دوسری طرف رام جنم بھومی سنگھرش سمتی، بجرنگ دل اور وشو ہندو پریشد جیسی انتہا پسند ہندو تنظیمیں متحرک ہو گئیں۔ مسلمانوں کے چیلنج نے ان کو نئی زندگی دے دی۔ انھوں نے کھلے طور پر کہنا شروع کیا کہ اگر مسلمانوں نے اجودھیا مارچ کیا تو انھیں اجودھیا پہنچنے سے پہلے کچل دیا جائے گا۔ اس کے بعد مسلم قائدین کی طرف سے یہ بہانہ نکال کر ۱۲ اگست کے مارچ کو ملتوی کر دیا گیا کہ مرکزی حکومت اس معاملہ میں دلچسپی لے رہی ہے، اور وہ دونوں فریقوں سے بات چیت کر کے اس مسئلہ کا ایسا حل نکالنا چاہتی ہے جو دونوں فریقوں کے لئے قابل قبول ہو۔

قومی آواز (۲۷ ستمبر ۱۹۸۸) کی رپورٹ کے مطابق، ۲۶ ستمبر کو نئی دہلی میں بابری مسجد تحریک کی مرکزی رابطہ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ رابطہ کمیٹی نے موجودہ حالات کے تحت یہ فیصلہ کیا کہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو لاکھوں مسلمانوں کا جو عوامی مارچ ہونے والا تھا، اس کو ابھی ملتوی کر دیا جائے۔ البتہ اسی تاریخ (۱۴ اکتوبر) کو قائدین تحریک کا وہ مارچ ہوگا جو اس سے پہلے ۱۲ اگست ۱۹۸۸ کو کیا جانا طے تھا۔

بابری مسجد تحریک کے نام نہاد لیڈر مسلسل یہ اعلان کرتے رہے کہ "اجودھیا مارچ ضرور ہوگا" مثلاً قومی آواز (۸ اکتوبر ۱۹۸۸) کے مطابق، بابری مسجد رابطہ کمیٹی کے کنوینر نے اعلان کیا کہ "مارچ کو ملتوی کرنے یا ختم کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اسی کے ساتھ انھوں نے کہا کہ "رابطہ کمیٹی نے وزیر اعلیٰ اتر پردیش نرائن دت تیواری سے تحریری درخواست کی ہے کہ وہ مارچ میں حصہ لینے والے مسلم رہنماؤں کو تحفظ مہیا کریں" (قومی آواز، ۸ اکتوبر ۱۹۸۸، صفحہ ۱)

بابری مسجد تحریک کی رابطہ کمیٹی کے کنوینر کی طرف سے ایک اخباری اعلان اس مضمون کا شائع ہوا کہ:

"کچھ اخباروں کے ذریعہ غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اجودھیا مارچ، جس میں ملک کے طول و عرض سے رضا کار حصہ لینے والے ہیں، ملتوی ہو گیا ہے۔ اجودھیا مارچ ملتوی نہیں ہوا ہے، اور اس کی تاریخ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ ہے۔ تمام ریاستی و ضلع اور شہر ایکشن کمیٹیوں سے اپیل ہے کہ وہ اجودھیا مارچ کی تیاری جاری رکھیں۔ محلے محلے، مسجد مسجد، رضا کاروں کا اندراج جاری رہے۔ اور قصبہ بہ قصبہ، محلہ بہ محلہ ٹولیاں بنائی جائیں۔ اور ان کے مصارف سفر کے لئے وسائل جمع کئے جائیں۔ ریل یا بس

سے فیض آباد ۱۳ اکتوبر تک پہنچنے کا پروگرام بنایا جائے۔" (سہ روزہ دعوت، یکم اکتوبر ۱۹۸۸)

بابری مسجد تحریک کے قائدین ۱۴ اکتوبر سے پہلے مسلسل یہی خبر نشر کرتے رہے کہ اجودھیا مارچ ۱۴ اکتوبر کو ضرور ہوگا، وہ ختم یا ملتوی ہونے والا نہیں۔ اس طرح کے اعلانات اور تقریروں نے کٹر ہندوؤں کو مزید ابھارا۔ انھوں نے مارچ کو ناکام کرنے کے لئے جوابی منصوبہ بنانا شروع کیا۔

اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ کیا، ان میں سے ایک یہ تھا کہ انھوں نے مجوزہ مارچ سے پہلے ۸ اکتوبر ۱۹۸۸ کو یوپی میں ایک بند منایا۔ یہ بند مجوزہ اجودھیا مارچ کے خلاف تھا۔ اس موقع پر جگہ جگہ اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔ اس کے نتیجہ میں تناؤ بڑھا اور یوپی کے کئی مقامات (مظفر نگر، علی گڑھ، بہرائچ، جھانسی کھتولی، فیض آباد، گوپال گنج وغیرہ میں فساد ہوگیا۔ اس میں بہت سے مسلمانوں کی جانیں گئیں اور انھیں زبردست مالی نقصانات ہوئے۔

نام نہاد قائدین کی طرف سے بدستور یہ اعلان کیا جاتا رہا کہ اجودھیا مارچ ضرور ہوگا۔ اسی کے ساتھ بار بار حکومت سے یہ مطالبہ بھی جاری تھا کہ وہ مارچ میں حصہ لینے والوں کے لئے تحفظ فراہم کرے۔ مگر حکومت نے تحفظ کی یقین دہانی کرنے سے عملاً انکار کر دیا۔ اس کے برعکس حکومت نے کہا کہ آپ لوگ اپنا مارچ ملتوی کر دیں۔ ہم دونوں فریقوں سے بات چیت کر کے کسی متفقہ حل تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

مسلم قائدین بار بار یہ اعلان کر چکے تھے کہ اجودھیا مارچ مجوزہ تاریخ کو ضرور ہوگا، وہ کسی بھی حال میں رکنے والا نہیں۔ مگر ایک طرف انھوں نے دیکھا کہ حکومت ان کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ایسی حالت میں مارچ کرنا، اپنے آپ کو فریق ثانی کی جارحیت کے حوالے کرنے کے ہم معنی ہوگا۔

دوسری طرف ۸ اکتوبر ۱۹۸۸ کو ہندوؤں کی کٹر جماعتوں نے جو بند منایا، اس کے نتیجہ میں یوپی کے مختلف علاقوں میں خوں ریز فسادات ہوئے۔ نیز اس قسم کے دوسرے سخت اسباب نے ظاہر کر دیا کہ اب اگر اجودھیا مارچ کیا جاتا ہے تو اس کے خلاف تشدد کا ہونا یقینی ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر خود مسلم عوام بھی مارچ میں اپنی دلچسپی کھو چکے تھے۔ موت کے اس سفر میں شرکت کرنے کے لئے وہ پرجوش نہیں رہے تھے۔

واضح علامات کی بنا پر قائدین نے محسوس کیا کہ موجودہ حالات میں اگر وہ مارچ کرتے ہیں تو انھیں مسلم

عوام کی حمایت حاصل نہ ہو سکے گی۔ وہ دو طرفہ طور پر بے یار و مددگار ہو کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ مسلم قائدین نے دوبارہ عافیت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اجودھیا مارچ کی تاریخ سے ایک دن پہلے اس کے التوا (صحیح تر لفظ میں خاتمہ) کا اعلان کر دیا۔

التوا کی آزمودہ تدبیر اختیار کر کے مسلم قائدین نے اپنی جان بچالی۔ مگر ۸ اکتوبر کے بندھ کے نتیجہ میں جو تشدد پیدا ہوا اس میں سیکڑوں مسلم خاندان بربادی کا شکار ہو کر رہ گئے۔ بابری مسجد کا مسئلہ بدستور شدید تر انداز میں باقی رہا۔ وہ مسلمانوں کی قبروں کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ نہ کر سکا۔

اجودھیا مارچ کی تاریخ سے کچھ پہلے میں نے ایک عام قسم کے مسلمان سے پوچھا: کیا اجودھیا مارچ ہوگا اس نے جواب دیا: "مولانا صاحب، جان ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے۔" مطلب یہ تھا کہ اب جب کہ اجودھیا مارچ کرنا اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا ہے تو کون ہوگا جو جان بوجھ کر اپنے آپ کو موت کے گڑھے میں ڈالے۔

مسلم عوام شروع میں اپنی سادگی اور ناسمجھی کی بنا پر "قائدین تحریک" کے ساتھ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قائدین کے جلسوں کی بھیڑ بڑھا کر وہ بابری مسجد کے مسئلہ کو حل کریں گے۔ مگر آخر میں انھیں نظر آیا کہ قائدین کی حقیقت پر شور ڈھول کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ نیز یہ کہ بابری مسجد کی طرف اقدام کرنے سے وہ صرف اپنے جان و مال کو کھوئیں گے، اصل مسئلہ جیسا ہے بدستور ویسا ہی پڑا رہے گا۔ اس قسم کا مارچ صرف ملت کی بربادی میں اضافہ کرے گا نہ کہ اس کی آبادی میں۔

یہ منظر دیکھنے کے بعد، اگرچہ تاخیر سے، مسلم عوام مسئلہ کی نوعیت کو سمجھ گئے۔ ان کے رویہ سے صاف ظاہر ہو گیا کہ مارچ ہونے کی صورت میں وہ قائدین تحریک کا ساتھ نہیں دیں گے۔ اب "قائدین تحریک" اپنے آپ کو میدان میں اکیلا پا رہے تھے۔ "لاکھوں عوام" کی مفروضہ بھیڑ دور دور تک کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی جو ان کی تقریروں پر نعرہ لگائے اور اس طرح ان کی شان قیادت میں اضافہ کرے۔ بے بسی اور تنہائی کا یہ منظر دیکھ کر انھوں نے الفاظ کا ایک مجموعہ مرتب کیا اور اس کو اخبار میں بھیج کر راتوں رات مارچ کے التوا کا اعلان کر دیا۔

یہاں مجھے ایک لطیفہ یاد آرہا ہے۔ یہ لطیفہ اجودھیا مارچ کے نعرہ پر پوری طرح چسپاں ہوتا ہے۔ مدینہ کے سفر (مارچ ۱۹۸۴) میں میری ملاقات ایک فلسطینی نوجوان سے ہوئی۔ ان کا نام مصطفی شاور تھا۔ وہ

تعلیم کی غرض سے مدینہ میں مقیم تھے اور نہایت دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے۔

مصطفی شادر نے ایک لطیفہ سنایا۔ ایک حاکم تھا۔ اس کا ایک اونٹ تھا جو ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ اور کھیتوں اور باغوں میں بہت نقصان کرتا تھا۔ گاؤں کے لوگ پریشان ہوکر اپنے خطیب (امام مسجد) کے پاس گئے اور کہا کہ اس کا کچھ علاج کیجیے۔ خطیب کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ اس نے گاؤں والوں سے کہا کہ تم سب جمع ہوکر میرے ساتھ چلو۔ میں حاکم کی قیام گاہ پر پہنچ کر اس کو بلاؤں گا۔ جب حاکم باہر آئے گا تو میں بلند آواز سے کہوں گا: یا حاکم جَمَلَك (اے حاکم تمہارا اونٹ) اس کے جواب میں تم لوگ پیچھے سے آواز لگانا: اِمْنَعْهُ عَنّا (اس کو ہم سے روک دے)

خطیب صاحب روانہ ہوئے اور جوش میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ شروع میں گاؤں کے لوگ بھی ان کے پیچھے تھے۔ مگر ساتھ ہی ان پر حاکم کا خوف طاری تھا۔ چنانچہ ایک ایک کرکے وہ راستہ میں چھٹنے لگے۔ یہاں تک کہ سب کے سب خاموشی سے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ آخر میں خطیب صاحب کے سوا کوئی اور باقی نہ رہا۔ خطیب صاحب جوش میں بڑھتے ہوئے حاکم کے مکان پر پہنچ گئے۔ وہاں دروازہ کھٹکھٹایا۔ حاکم باہر آیا تو اس کو دیکھ کر خطیب صاحب نے حسب قرارداد بلند آواز سے کہا: یا حاکم جملک۔ ان کا خیال تھا کہ گاؤں والے ان کے پیچھے ہیں اور وہ سب مل کر امنعہ عنا کا نعرہ لگائیں گے۔ مگر ان کی امیدوں کے خلاف پیچھے سے کوئی آواز نہ آئی۔ وہ بار بار یا حاکم جملک کہتے رہے مگر پیچھے کوئی نہ تھا جو اس دوسرے جملہ کو دہرائے۔ حاکم نے پوچھا کہ آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ اب خطیب صاحب نے پیچھے مڑکر دیکھا تو انھیں معلوم ہوا کہ وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ اس صورت حال سے وہ گھبرا اٹھے۔ انھوں نے اپنے سابقہ نعرے کو بدل دیا اور حاکم سے کہا: یحتاج الی الناقۃ (وہ اونٹنی چاہتا ہے) یہ کہا اور فوراً واپس روانہ ہوگئے۔

تقریباً یہی حال بابری مسجد کی بازیابی کے لئے اجودھیا مارچ کے نعرہ کا ہوا ہے۔ نام نہاد قائدین نے اعلان کیا تھا کہ وہ بابری مسجد کی بازیابی کے لئے دو مارچ (۱۲ اگست، ۱۴ اکتوبر) کریں گے۔ انھوں نے اپنی پرجوش تقریروں میں کہا تھا کہ ملک بھر سے لاکھوں مسلمان "بابری مسجد لے کے رہیں گے" کا نعرہ لگاتے ہوئے اجودھیا پہنچیں گے اور بابری مسجد میں فاتحانہ داخل ہوکر وہاں جمعہ کی نماز ادا کریں گے۔

اس کے بعد حالات میں ایسی تبدیلی ہوئی کہ اجودھیا مارچ لوگوں کو خونی مارچ دکھائی دینے لگا۔ مسلمان عام طور پر یہ کہنے لگے کہ اجودھیا مارچ تو موت کی طرف مارچ ہے۔ ہم کیوں خواہ مخواہ اپنے آپ کو مروائیں۔ اور اپنے بچوں کو یتیم اور اپنی عورتوں کو بیوہ کرنے کے لئے بے فائدہ اجودھیا مارچ کریں۔

اب قائدین تحریک کا وہی حال ہوا جو مذکورہ امام کا ہوا تھا۔ انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو انھیں "لاکھوں کا مجمع" کہیں دکھائی نہیں دیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے نعرہ کو بدل دیا۔ اب وہ اجودھیا مارچ کی اپیل کرنے کے بجائے مسلمانوں سے یہ کہہ رہے ہیں کہ مسجدوں میں جاکر دعا کرو۔ مسلمان تو صرف خدا کی طرف مارچ کرنے والا ہوتا ہے، انسانوں کی طرف مارچ کرنے سے اسے کیا کام۔

اس میں میں صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ قائدین اگر یہی بات شروع سے کہتے تو یقیناً ان کے الفاظ کی قیمت تھی مگر اب ان کے ان الفاظ کی کوئی قیمت نہیں۔ اب اس قسم کے الفاظ ان کی بدترین نااہلی کا اشتہار ہیں، نہ کہ ان کی اہلیت اور لیاقت کا ثبوت۔

میری ڈائری میں ۱۴ فروری ۱۹۸۶ کے تحت یہ الفاظ درج ہیں:

آج جمعہ کا دن تھا۔ بابری مسجد تحریک کے لیڈروں کی پکار پر آج "یوم بابری مسجد" منایا گیا دہلی اور یوپی کی مسجدوں میں پرجوش تقریریں ہوئیں۔ میں نے آج دہلی کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ امام صاحب آج معمول سے زیادہ پرجوش نظر آرہے تھے۔ وہ بلند آواز سے تقریباً چیخنے کی زبان میں بول رہے تھے۔ انھوں نے کہا:

"ہم اپنی گردنیں کٹوا دیں گے۔ ہمارے اوپر چاہے ٹینک چلا دئے جائیں اور توپ کے گولے برسائے جائیں، مگر ہم یہ برداشت نہیں کرسکتے کہ ہماری مسجدوں پر قبضہ کیا جائے اور ان کی بے حرمتی کی جائے" وغیرہ وغیرہ۔

نماز کے بعد مسجدوں سے جلوس نکالے گئے۔ لال کنواں (دہلی) میں جلوس نے شدت اختیار کرلی پولیس نے گولی چلائی جس سے دو مسلم نوجوان مرگئے۔ اسی طرح یوپی کے بعض اور مقامات پر گولی چلی اور مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

ایک دن کے لئے ہنگامہ کرنے اور یک طرفہ نقصان اٹھانے کے بعد مسلمان خاموش ہوگئے۔ اور "بابری مسجد" بدستور "رام جنم بھومی مندر" بنی رہی۔

اس دن کا تجربہ دیکھ کر میری زبان پر ایک جملہ آگیا تھا جو بعد کو الرسالہ ستمبر ۱۹۸۶ کے سرورق پر شائع ہوا۔ وہ جملہ یہ تھا ——— بزدلی دکھا کر چپ ہونے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی بزدلی دکھائے بغیر چپ ہو جائے۔

قربانی کے نام پر بربادی

بابری مسجد کی بازیابی کے لئے نام نہاد قائدین کی تحریک اپنے اصل مقصد میں تو ایک فی صد بھی کامیاب نہیں ہوئی۔ مگر اس نے مسلمانوں کے لئے انتہائی سنگین مسائل پیدا کر دئے۔ ایک مسلم اخبار نے "دہشت کے مارے مسلمان" کے عنوان کے تحت لکھا ہے: "پورا ملک فرقہ واریت کی گھناؤنی آگ کی لپیٹ میں ہے۔ نفرت، غصہ، انتقام اور کشیدگی سے مل کر جو ماحول بن رہا ہے، اس نے معصوم، بے قصور اور امن پسند انسانوں کے لئے باعزت اور باہمت طور پر زندہ رہنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن بنا دیا ہے (ہجوم، ۱۸-۲۴ نومبر ۱۹۸۸)

یہ حالات اگرچہ سخت افسوسناک ہیں۔ مگر ان کا مثبت فائدہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے پہلی بار حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنا شروع کیا ہے۔ اب وہ سمجھ رہے ہیں کہ ان حالات کی ذمہ داری دوسروں سے زیادہ خود اپنے آپ پر ہے۔ ان حالات کو پیدا کرنے والے وہ نام نہاد مسلم لیڈر ہیں جو قربانی کے نام پر مسلمانوں کو بربادی کی راہوں میں دوڑاتے رہے۔

ماضی میں جذباتی سیاست کی نمائندگی کرنے والے ایک مسلم اخبار نے لکھا ہے کہ "اس میں قصور کچھ ہمارا بھی ہے۔ ہم بھی جذبات سے مغلوب ہو گئے۔ ہمارے سامنے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ نہیں رہا۔ ہم نے مسئلہ کو تدبیر کے بجائے جذباتی انداز سے حل کرنے کی غلطی کی ..... یہ جدوجہد اشتعال انگیز بیانات اور تقریروں سے سر ہونے والی نہیں ..... "چڑھ جا بیٹے سولی پر" کا عمل سودمند ثابت ہونے والا نہیں (ندائے ملت، ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۸)

یہ اطمینان کی بات ہے کہ جذباتی سیاست کے سنگین نتائج دیکھنے کے بعد مسلمان اب اس سے دور ہونا چاہتے ہیں۔ "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" اور "چڑھ جا بیٹے سولی پر" جیسے نعروں پر احمقانہ قربانی کے ایک سو سال ضائع کرنے کے بعد اب ان کی آنکھیں کھل رہی ہیں۔ یہ نیا طرز فکر انھیں نام نہاد قائدین سے دور کرے گا، اور قائدین سے دوری ہی کا دوسرا نام منزل سے قریب ہونا ہے۔

الٹا نتیجہ

بابری مسجد کے نام پر اٹھائی جانے والی تحریک مکمل طور پر الٹا نتیجہ برآمد کرنے والی ثابت ہوئی ہے۔ اس کا یہ خطرناک نتیجہ نکلا ہے کہ ہندوؤں کے کٹر عناصر پہلے سے زیادہ طاقت ور ہو کر باہم متحد ہو گئے ہیں اور مسلمانوں کے لئے سنگین تر بن خطرہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

۱۳ نومبر ۱۹۸۸ کا واقعہ ہے۔ میں بھوپال ایئرپورٹ پر دہلی کی فلائٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ بھوپال کے ایک باشندہ مسٹر راج تیواری (عمر ۵۰ سال) نے اپنا ایک ذاتی تجربہ مجھے بتایا۔ وہ بزنس کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھیں ۲۲ اگست ۱۹۸۸ کو ویسٹ بنگال کے شہر بانکورا (Bankura) جانا پڑا۔ وہاں وہ پشپک ہوٹل میں ٹھہرے، اس کے بغل میں ایک مندر تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ مندر کے اوپر ایک بورڈ لگا ہوا ہے جس پر لکھا ہے:

ضلع شیوسینا کاریالیہ، پچھمی بنگال

راج تیواری صاحب نے کہا کہ میں اس بورڈ کو دیکھ رہا تھا کہ تقریباً ۷۰ سال کا ایک بوڑھا بنگالی وہاں آگیا۔ راج تیواری صاحب چونکہ بنگلہ زبان جانتے تھے اس لئے اسی زبان میں اس سے گفتگو ہوئی۔ بنگالی نے پوچھا کہ کیا دیکھ رہے ہو۔ راج تیواری صاحب نے کہا کہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ مندر کے بازو میں سینما کیسی۔ بنگالی نے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے، انھوں نے اپنا نام اور پتہ بتایا۔ اس کے بعد بنگالی نے کہا کہ اندر آؤ۔ وہ راج تیواری صاحب کو اندر ایک کمرہ میں لے گیا جو دفتر کی مانند تھا اور کچھ لوگ وہاں کام کر رہے تھے۔ اس بنگالی کا نام پنکج مکرجی تھا۔

یہاں دیوار پر بہت سے ہندو لیڈروں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ مثلاً شیواجی، رانا پرتاپ، ساورکر، ہیڈگواڑ، وغیرہ۔ یہ تمام تصویریں دو فٹ چوڑی اور دو فٹ لمبے سائز میں تھیں۔ ان کے درمیان ایک زیادہ بڑی قد آدم تصویر لگی ہوئی تھی جو دو فٹ چوڑی اور چار فٹ لمبی تھی۔ بقیہ تصویریں نصف حصۂ جسم کی تھیں مگر بڑی تصویر سر سے پاؤں تک پورے قد کی تھی۔

راج تیواری صاحب نے غور کر کے اس تصویر کو پہچانا تو وہ سید شہاب الدین کی تصویر تھی۔ انھوں نے مذکورہ بنگالی سے پوچھا کہ سید شہاب الدین کی تصویر یہاں کیوں لگی ہوئی ہے۔ وہ تو آپ کے دشمن ہیں۔ مذکورہ بنگالی نے جواب دیا کہ بیٹے، یہ ہمارا دیوتا ہے۔ جو کام ہمارے دوسرے لیڈر ہزار

سال میں بھی نہ کر سکے، اس کو بھگوان شہاب الدین نے ڈیڑھ سال میں کر دیا۔ سیکڑوں سال سے سوئے ہندو کو شہاب الدین نے ڈیڑھ سال میں جگا دیا۔ ہم تو ان کا مندر بنائیں گے اور ان کی پوجا کریں گے۔

مسٹر راج تیواری نے یہ قصہ ۱۳ نومبر کی شام کو ۳ بجے مجھے بھوپال ایئرپورٹ پر لکھوایا اور اس کے نیچے اپنے دستخط کئے۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ کوئی شخص اس بات کو خود اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہے تو وہ میرے ساتھ بانکورہ چلے۔ میں اس کو یہ چیز وہاں دکھاؤں گا۔

اطلاعات بتاتی ہیں کہ مسٹر راج تیواری کی یہ رپورٹ انوکھی نہیں۔ چنانچہ ہفت روزہ ندائے ملت (لکھنؤ) نے اپنے اداریہ مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۸ میں لکھا ہے کہ "ایک بڑے ہندو لیڈر کے گھر ان کے ایک ہندو دوست گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ شہاب الدین صاحب کی ایک بڑی تصویر دیوار پر لگی ہوئی ہے۔ پھول کی مالا بھی چڑھا رکھی ہے۔ ان کے ہندو دوست کو سخت تعجب ہوا کہ شہاب الدین کی فوٹو اس گھر میں کیسے۔ انھوں نے بہت تعجب سے پوچھا کہ یہ فوٹو آپ کے یہاں کیسے۔ انھوں نے جواب دیا کہ شہاب الدین ہمارا محسن ہے۔ اس نے ہندو قوم کو متحد کر دیا۔ دراصل یہی ہوا۔"

ایسے کھلے ہوئے نشانات ظاہر ہونے کے بعد بھی اگر مسلمان اپنے دوست اور اپنے دشمن کو نہ پہچانیں تو ان سے زیادہ نادان قوم دنیا میں اور کوئی نہ ہوگی، نہ حال میں اور نہ ماضی میں۔

تعمیر کی طرف

از: مولانا وحید الدین خاں

مستقبل کی تعمیر، لاقانونیت کا مسئلہ، تاریخ کا سبق
ترقی اور اتحاد، اصلاح کی طرف، نمونۂ انسانیت

صفحات ۶۴ ہدیہ ۶ روپیہ

دینِ کامل

مولانا وحید الدین خاں

دینِ کامل

از مولانا وحید الدین خاں

قرآن میں اسلام کو دینِ کامل کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام دینِ مستحکم ہے۔ اسلام کا ظہور، دینِ خداوندی کی تاریخ میں ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہے۔ اسلام نے خدا کے دین کے ساتھ انسانی تعدی کے دور کو ختم کر دیا اور دین کو تمام پہلوؤں سے کامل کر کے اس کو ایسا مستحکم بنا دیا کہ قیامت تک اس کی برتری باقی رہے وہ اپنے پیروؤں کے لیے ابدی سرفرازی کی ضمانت بن جائے۔

صفحات ۳۶۸ ہدیہ ۴۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

۱۔ فرینکفرٹ (جرمنی) میں ۵ — ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۸ کو چالیسویں بک فیر ہوئی۔ اس موقع پر اسلامی مرکز کی انگریزی کتابیں بطور نمائش رکھی گئیں۔ اس کا ذکر نیشنل بک ٹرسٹ (انڈیا) کے کتابچہ میں صفحہ ۲۱ پر کیا گیا ہے۔

۲۔ آل انڈیا سنیاسی کانفرنس ۲-۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو نئی دھلی (اجمل خاں پارک) میں ہوئی۔ صدر اسلامی مرکز نے منتظمین کی دعوت پر ۲ اکتوبر کے اجلاس میں شرکت کی اور ہندو مسلم مسئلہ کے حل کے بارہ میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ صدر اسلامی مرکز کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مسائل کا حل یہ ہے کہ دونوں کے درمیان تلخی کو ختم کیا جائے اور حل رخی (Solution-oriented) پالیسی کو اپنایا جائے۔

۳۔ تہران میں دوسری انٹرنیشنل بک فیر ۱۷ نومبر سے ۲ دسمبر ۱۹۸۸ تک ہوئی۔ اس موقع پر دنیا کے مختلف حصوں میں "اسلامک کلچر اینڈ سویلائزیشن" پر چھپنے والی کتابوں کی عالمی نمائش کی گئی۔ نمائش کے علاوہ یہاں کتابوں کی فروخت کا بھی انتظام تھا۔ اس موقع پر نمائش کے ذمہ داروں کی طرف سے اسلامی مرکز کی انگریزی کتابیں بھی برائے نمائش رکھی گئیں۔

۴۔ میسی مرکز ویٹیکن کے تحت روم میں ایک کانفرنس ہوئی جس کا عنوان تھا:

International meeting for peace

یہ کانفرنس ۲۵ اکتوبر سے ۲۹ اکتوبر تک روم (اٹلی) میں ہوئی۔ اس انٹرنیشنل کانفرنس میں صدر اسلامی مرکز کو شرکت کا دعوت نامہ ملا تھا اور انھیں اس موقع پر ایک مقالہ "اسلام اور امن" کے موضوع پر پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ صدر اسلامی مرکز اور ان کے مساعد کے لیے دو ٹکٹ بھی آچکے تھے۔ نیز روم سے بار بار ٹیلی فون آتے رہے کہ ضرور اس میں شرکت کریں۔ مگر بعض اتفاقی اسباب کی بنا پر صدر اسلامی مرکز اس میں شریک نہ ہو سکے۔ البتہ اس موقع پر پیش کرنے کے لیے جو انگریزی مقالہ تیار کیا گیا تھا، اس کی کاپی ویٹیکن کے ذمہ داروں کے پاس بذریعہ ڈاک روانہ کر دی گئی۔

۵۔ ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی (ڈائرکٹر، اسلامک سوسائٹی آف آرینج کاؤنٹی، امریکہ) نے الرسالہ

(انگریزی) پڑھنے کے بعد ایک خط مورخہ ۱۶ جون ۱۹۸۷ روانہ کیا ہے۔ اس میں وہ اس کے بارہ میں اپنا تاثر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

I am very impressed with the content and style of Al-Risala. This is, to my knowledge, one of the best Dawa magazines published anywhere in the world. May Allah bless you and your efforts.

۶۔ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۸ کو شام سات بج کر ۴۵ منٹ پر نشر کی گئی۔ اس تقریر کا عنوان تھا: مذہب اور سیاست۔ تقریر کا مقررہ وقت ۱۰ منٹ تھا۔

۷۔ امریکی ادارہ "انٹرنیشنل ریلیجس فاؤنڈیشن" اور اسلامی مرکز کے تعاون سے عرفان انیس عمر صاحب نے جولائی۔ اگست ۱۹۸۸ میں اسپین کا سفر کیا۔ اولاً انھوں نے اسپین میں نوجوانوں کی کانفرنس میں شرکت کی جس میں ۵۰ ملکوں سے تمام بڑے مذاہب کے نمائندے آئے ہوئے تھے۔ کانفرنس کے دوران مختلف لوگوں سے اسلام کے موضوع پر گفتگو ہوئی اور ان کو اسلامی مرکز کا انگریزی لٹریچر دیا گیا۔ شرکاء میں بہت سے ایسے افراد تھے جو اب تک نہ کسی مسلمان سے ملے تھے اور نہ اسلام کی بابت جانتے تھے۔ اس موقع پر انگریزی الرسالہ اور اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات اسلام کے تعارف کے لیے بہت مفید ثابت ہوئیں۔ اس سفر میں میڈرڈ، قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، تولیدو وغیرہ مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا اور ہر جگہ اسلامی مرکز کا تعارف کرایا گیا۔ واپسی میں عرفان انیس صاحب جنیوا کے اسلامک سینٹر میں بھی گئے۔ یہاں کے لوگ الرسالہ سے اور اسلامی مرکز کے مشن سے واقف تھے۔ ان لوگوں سے تفصیلی گفتگوئیں ہوئیں اور اسلامی مرکز کی مطبوعات ان کی لائبریری کے لیے پیش کی گئیں۔

۸۔ صنعاء (یمن) میں ایک اسلامی کانفرنس ۲۹ اکتوبر تا ۲ نومبر ۱۹۸۸ ہوئی۔ اس کی دعوت کے تحت صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس کا مفصل سفرنامہ انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔

۹۔ کابل (افغانستان) میں ایک بین اقوامی سیرت کانفرنس ۲۳-۲۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو ہوئی۔ اس کی دعوت کے تحت صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور سیرت کے موضوع پر ایک

مقالہ پیش کیا۔ یہ مقالہ انشاء اللہ الرسالہ انگریزی میں شائع کر دیا جائے گا۔ سفر کی روداد آئندہ الرسالہ میں شائع ہوگی۔

۱۰۔ پاکستان کی حکومت کے تحت ۱۹۸۸ میں سیرت پر ایک عالمی مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں غیر ملکی زبانوں کا پہلا انعام صدر اسلامی مرکز کی کتاب (پرافٹ آف ریوولیوشن) کو ملا۔ اس کی خبر پاکستان کے انگریزی روزنامہ ڈان (۲۷ اکتوبر ۱۹۸۸) نے ان الفاظ میں دی ہے:

The award of 2,000 dollars for the best seerat book in foreign languages was won by an English book — *Muhammad: The Prophet of Revolution* — written by Maulana Wahiduddin Khan.

۱۱۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: ایک سال سے الرسالہ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس رسالہ سے پہلے میرا ذہن ہندستان کے تمام مسلمانوں ہی کی طرح تھا۔ مگر آپ کی تحریروں کا کرشمہ کہہ لیں کہ میرے سوچنے کا انداز اب بالکل بدل گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کو اپنے سوچنے کا انداز بدلنا ہوگا، تبھی ایک نئے دور کا آغاز ہو سکتا ہے۔ ورنہ تنزل کے علاوہ کچھ بھی حاصل ہونے والا نہیں۔ "میدان عمل" کافی پسند آیا (ایم بی پیرزادہ، سعودی عرب)

۱۲۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: میری رہائش گاہ کراچی میں ہے۔ ایک دن میں اپنے دوست کی دکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک صاحب آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جس کا نام "اللہ اکبر" تھا۔ ان سے کتاب لے کر میں نے دو صفحے پڑھے۔ پھر ان سے کہا کہ اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات عرض کروں۔ انھوں نے کہا کہ فرمائیے۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کتاب کی قیمت اگر میں آپ کو دے دوں تو کیا یہ کتاب آپ مجھے دیدیں گے۔ وہ صاحب راضی ہوگیے۔ وہ کتاب میں گھر لے آیا اور ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ اور آپ کی تمام کتابیں جو کراچی میں دستیاب ہیں وہ بھی خرید کر پڑھ ڈالیں۔ ایک صاحب سے الرسالہ (شمارہ ۱۴۱) بڑی مشکل سے لیا اور اس کو بھی پڑھ ڈالا۔ یہ رسالہ بے انتہا پسند آیا۔ مجھے آپ کی کتابوں اور الرسالہ پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ ان کو پڑھنے سے مجھے بہت فائدے ہوئے ہیں۔ (شیخ محمود خاں، کراچی ۲۹)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے راہل آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

Delhi Postal Regd. No. D(SE) 243 RN 28822/76 January 1989 No 146

GIFTING The Word of God

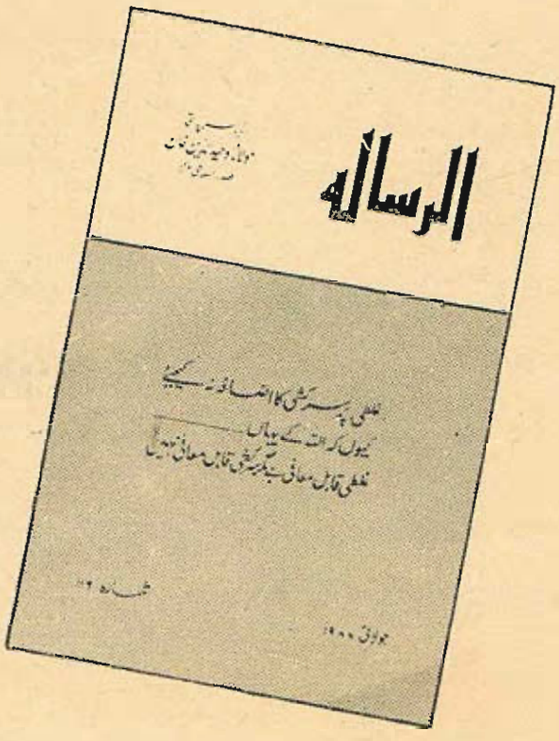

To spread the word of God is the highest form of charity. It appeals to the mind, the heart, the soul, that being the earnest endeavour of this magazine, how noble-spirited it would be of you, dear readers, if you sent it on regularly to friends and relatives. Make a **GIFT** of it. Think of a whole year's subscription as being both a delightful present as well as a contribution to a worthy cause.

Please send AL-RISALA to my friend/ relative to the following address:

Name .....

Address .....

.....

.....

(Please use separate sheet for more than one address)

I am enclosing cheque/Postal Order/ Bank Draft/M.O. Receipt No. .....

Please tick box where applicable

- ☐ URDU
- ☐ ENGLISH
- ☐ ONE YEAR
- ☐ TWO YEARS

Annual Subscription Rates

INLAND	RS. 48
ABROAD	
By air-mail	$ 20
By surface mail	$ 10

Please send this together with the payment to the Circulation Manager ALRISALA C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

GIFT AL-RISALA TO YOUR FRIENDS & RELATIVES